امین احسن اصلاحی

دعوتِ دین

اور

اس کا طریقِ کار

دعوتِ دین

اور

اس کا طریق کار

دعوتِ دین

اور

اس کا طریقِ کار

تالیف:

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

فاران

فاران فاؤنڈیشن

لاہور — پاکستان

جدید کمپیوٹرائزڈ ایڈیشن

اہتمام: ———— حسن خاور

مطبع: ———— حسن عمر پرنٹرز۔ لاہور

اشاعت: ———— کمپیوٹرائزڈ ایڈیشن۔ طبع سوم

تاریخ اشاعت: ———— ذیقعدہ ۱۴۳۵ھ۔ ستمبر ۲۰۱۴ء

ادارہ: ———— فاران فاؤنڈیشن

علق پریس بلڈنگ، بالمقابل (PTV) اسٹیشن،

19۔ اے ایبٹ روڈ، لاہور۔

فون: 042-36303244

قیمت: ———— 280 روپے

فہرس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

عرضِ ناشر

''میں اس بات کا آرزومند تھا کہ میری ناچیز تالیفات، بالخصوص تدبرقرآن، کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داری کوئی ایسا شخص اٹھائے جو اس فکر کا حامل ہو جو ان کتابوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے یہ آرزو پوری کر دی۔ عزیزم ماجد خاور صاحب سلمہٗ میرے پرانے رفقاء میں سے ہیں۔ وہ نہ صرف میرے فکر سے، بلکہ بحیثیت مجموعی پورے فکر فراہی سے بڑی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ انہوں نے پورے عزم و حوصلہ کے ساتھ اب اس فکر کی ترویج و اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے اور وہ اپنے ادارہ: فاران فاؤنڈیشن کو، اس کے قیام کے دن سے ہی، اسی مقصد کے لیے مختص کیے ہوئے ہیں۔ مجھے ان کی صلاحیتوں سے پوری توقع ہے کہ وہ اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دے سکیں گے اور خدا نے چاہا تو آئندہ تھوڑے عرصہ میں، ان کے اور ادارہ تدبر قرآن و حدیث کے تعاون سے وہ قرآنی فکر و فلسفہ بالکل واضح ہو کر لوگوں کے سامنے آ جائے گا جو اس عہد کے چیلنج کا اصل جواب ہے''۔

حضرت الاستاذ مولانا امین احسن صاحب مدظلہ العالی نے جس بے پایاں محبت و اعتماد کا اظہار اپنی محولہ بالا تحریر —— دیباچہ تدبر قرآن —— میں فرمایا ہے وہ مجھ عاجز کے لیے سرتاسر اعزاز ہے۔ ان کے اور میرے درمیان اصلاً استاد و شاگرد کا رشتہ ہے جو ۱۹۶۲ء میں قائم ہوا۔ مصنف و ناشر کا رشتہ ان کی نظر عنایت سے ۱۹۷۶ء میں استوار ہوا۔ انہوں نے میری تعلیم و تربیت میں آج تک جو کمال رافت فرمائی اور مشقت اٹھائی ہے رسمی اسلوبِ

بیان میں اس کا اظہار ناممکن ہے۔ ان سے نسبت ہی میرا سرمایہ حیات ہے۔ ان کے دیے ہوئے پروگرام کی تکمیل ہی میری زندگی کا مشن اور ترجیح اوّل ہے۔ انھوں نے جو شرف بخشا اور اپنے جس عظیم اعتماد کا اظہار فرمایا ہے خدائے بزرگ و برتر کے حضور ملتجی ہوں کہ وہ مجھے ان کی امیدوں کا مصداق بنائے اور فکرِ فراہی و اصلاحی کی ترویج واشاعت کا جو زریں تاج مجھ بے مایہ فقیر کے سر پر سجایا گیا ہے اس کی لاج رکھے۔ وبیدہ اللہ التّوفیق!

حضرت الاستاذ کا ذوق آشنا ہوتے ہوئے میرے لیے یہ لازم تھا کہ ان کی نگارشات کو ان کے مطلوبہ معیار کے مطابق پیش کروں۔ چنانچہ میں نے اپنے طور پر ان پر کام شروع کر دیا۔ میں نے بیک وقت شاگرد و ناشر، دونوں حیثیتوں کے تقاضوں کو پورا کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ الحمد للہ نظر ثانی اور از سرِ نو کتابت کا بیشتر کام مکمل ہو چکا ہے۔ یہ پیشکش بھی اسی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی ایک کوشش ہے۔ اس کتاب کے جدید ایڈیشن میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا گیا ہے:

۱۔ متن پر نہایت اہتمام سے نظر ثانی کی گئی ہے۔

۲۔ قرآن مجید کے تمام حوالے مکمل نقل کیے گئے ہیں اور ان کا ترجمہ تدبر قرآن کے مطابق کر دیا گیا ہے۔

۳۔ کتاب میں موجود تمام اقتباسات کو ان کے اصل ماخذوں سے تقابل کر کے درست کر دیا گیا ہے اور حوالے مکمل نقل کر دیے گئے ہیں۔ مزید برآں بعض جگہ اگر صرف ترجمہ دیا گیا تھا تو ان کی اصل عبارتیں بھی دے دی گئی ہیں۔

اس کتاب کے جدید ایڈیشن کی پیشکش کے غیر معمولی اہتمام کی وجہ سے اس کی دستیابی میں کچھ عرصہ تعطل رہا جس کے لیے میں انتہائی معذرت خواہ ہوں۔ امید ہے کہ اس کے امتیازی محاسن کی روشنی میں اس کے قدرداں مجھے معاف فرما دیں گے۔ اب اس کا موجودہ ایڈیشن ان شاء اللہ ہمیشہ دستیاب رہے گا۔

اس پیشکش میں ہر ممکنہ احتیاط کے باوصف، اپنی کوتاہیوں کے لیے پیشگی معذرت خواہ

ہوں۔ میری درخواست ہے کہ اس کے قارئین بھی اس کام میں حصہ لیں۔ ان کی جانب سے ہماری کوتاہیوں کی نشان دہی اور بہتری کی ہر قابل عمل تجویز خندہ پیشانی اور شکریہ کے ساتھ قبول کی جائے گی اور آئندہ اشاعتوں میں ان کا لحاظ رکھا جائے گا۔

اس پیشکش کی صورت میں مجھ بندۂ حقیر وفقیر سے جو خدمت بن پائی یہ سرتاسر اُس کی توفیق اور تائید ونصرت کا کمال ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین۔

لاہور　　　　　　　　　　　　والسلام

۲۴ فروری ۱۹۸۸ء　　　　　　　　ماجد خاور (رحمۃ اللہ علیہ)

دیباچہ

اس کتاب میں انبیائے کرام کا طریقہ تبلیغ میں نے تفصیل کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس زمانہ میں جس طرح دین کا مفہوم لوگوں کے ذہن میں ادھورا اور ناقص ہے، اسی طرح دین کی تبلیغ کا مفہوم بھی بہت ہی محدود اور غلط ہے۔ میں نے اس کتاب میں دین کو بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے (جیسا کہ وہ فی الواقع ہے) سامنے رکھا ہے۔ اسی حیثیت سے اس جدوجہد کے تمام تقاضوں اور اس کے تمام مراحل کی تفصیل کی ہے جو اس نظام کو برپا کرنے کے لیے اختیار کرنی پڑتی ہے۔ میں نے اس کتاب کے ہر باب کی بنیاد قرآن مجید کے محکم دلائل پر رکھی ہے۔ پھر جہاں کہیں ضرورت محسوس کی ہے، صحیح احادیث سے اس کی وضاحت کی ہے مجھے امید ہے کہ جو لوگ اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے وہ اس فہم قرآن میں بھی معین پائیں گے۔

لاہور — والسلام

جون ۱۹۵۱ء — امین احسن اصلاحی (رحمۃ اللہ علیہ)

باب ۱

مروجہ طریقہ تبلیغ کی غلطیاں

تبلیغ کا لفظ سنتے ہی قدرتی طور پر آدمی کا ذہن ان تدبیروں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو ایک مدت سے مسلمانوں میں تبلیغ دین کے لیے رائج و مقبول ہیں۔ ایک زمانہ دراز کا تعامل جب کسی کام کے لیے کسی طریقہ کار کو مانوس بنا دیتا ہے تو دلوں پر اس کا ایسا سکہ بیٹھ جایا کرتا ہے کہ لوگ اس سے علیحدہ ہو کر کچھ سوچ ہی نہیں سکتے۔ وہی طریقہ اس کے انجام دینے کا بالکل قدرتی طریقہ خیال کیا جانے لگتا ہے۔ جو شخص بھی اس کام کو کرنے کا ارادہ کرتا ہے وہی طریقہ اختیار کرتا ہے یہاں تک کہ بسا اوقات آدمی اس سے بچنے کا ارادہ کر کے گھر سے نکلتا ہے لیکن چلتے چلتے پاؤں آپ سے آپ پھر اسی پٹے ہوئے راستہ پر پڑ جاتے ہیں جس سے بچنے کا ارادہ کر کے وہ گھر سے نکلا تھا۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ پہلے موجودہ طریقہ تبلیغ کی غلطیاں اختصار سے بیان کر دی جائیں۔

ہمارے نزدیک مروجہ طریقہ تبلیغ میں علمی اور عملی، دونوں قسم کی غلطیاں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ یہ طریقہ تبلیغ اپنے فلسفہ کے اعتبار سے بھی غلط ہے اور اپنے طریقہ کار کے پہلو سے بھی غلط ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تبلیغ اسلام کے نام سے اب تک جتنی جدوجہد بھی کی گئی ہے وہ بیشتر، نہ صرف یہ کہ اصل مقصد کے لحاظ سے لا حاصل رہی ہے، بلکہ الٹا اس سے اسلام کی دعوت کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ ہم پہلے اس طریقہ کی علمی غلطیوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

مروجہ طریقہ تبلیغ کی علمی غلطیاں

پہلی غلطی

پہلی اور سب سے بڑی علمی غلطی جو اب تک اسلام کو پیش کرنے میں کی ہے وہ یہ ہے کہ پیش کرنے والوں کو اپنا اور اسلام کا صحیح موقف نہیں سمجھا جس کے سبب سے وہ اس کو اس حیثیت سے پیش کرنے سے قاصر رہے جس حیثیت سے اس کو قرآن نے پیش کیا تھا۔ قرآن نے اس کو اس حیثیت سے پیش کیا تھا کہ ابتدائے آفرینش سے خدا کا دین یہی ہے جب کبھی بھی اور جس قوم میں بھی خدا نے اپنے کسی نبی کو بھیجا ہے اسی دین کے ساتھ بھیجا ہے۔ قومیں خدا کے بھیجے ہوئے اس دین میں برابر خرابیاں پیدا کرتی رہی ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کے ذریعہ سے ان خرابیوں کی اصلاح کرتا رہا ہے یہاں تک کہ اس نے اپنے آخری رسول کے ذریعہ سے اپنے تمام نبیوں اور رسولوں کے اس دین کو بالکل صحیح اور مکمل صورت میں نازل کر کے اس کو ہمیشہ کے لیے آمیزش اور تبدیلی و تحریف کے خطرہ سے محفوظ کر دیا۔ یہ دین قرآن مجید کی صورت میں محفوظ ہے۔ یہ کسی خاص قوم کا دین نہیں ہے، بلکہ تمام بنی نوع آدم کا دین اور خدا کے تمام نبیوں کا لایا ہوا دین ہے جو اس کو مانے وہ مسلم ہے، جو نہ مانے وہ غیر مسلم ہے۔ یہ نہ تو خدا کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق کرتا، نہ اس کی کسی کتاب کا انکار کرتا، نہ کسی پر اپنی مطلق فضیلت کا مدعی ہے۔ اس کا دعویٰ صرف یہ ہے کہ یہ تمام نبیوں کی تعلیم کا قابل اعتبار مجموعہ اور ان کی تعلیموں کو مکمل کرنے والا ہے۔ لیکن ہمارے مبلغوں اور مصنفوں نے اس کے بالکل برعکس اس کو مسلمان قوم کے دین اور دنیا کے تمام دوسرے ادیان کے ایک حریف کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس کی سچائی ثابت کرنے کے لیے

دوسری آسمانی کتابوں کی تعلیموں کا مذاق اڑایا اور بسا اوقات اس جوش میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ ان کی اُن تعلیمات کا بھی مذاق اڑایا جن پر ایمان لانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری بحیثیت مسلم اور تمام انبیاء کے مصدق ہونے کے، خود ان پر عائد ہوتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کا مقابلہ کر کے دوسرے انبیاء کو کمتر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ قرآن مجید میں اس طرح کی مطلق ترجیح وتفضیل کی صریح ممانعت ہے اور یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر پیغمبر کو کسی نہ کسی پہلو سے فضیلت دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کے جو پہلو تھے وہ تعین کے ساتھ واضح کر دیے گئے تھے اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کے ساتھ ممانعت فرمائی تھی کہ دوسرے انبیاء کے مقابل میں آپ کے لیے مطلق فضیلت کا دعویٰ نہ کیا جائے۔ لیکن مسلمانوں نے اسلام اور پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اندھی بہری عصبیت قومی کے جوش کے ساتھ پیش کیا اور اس غلطی کا ارتکاب صرف عام واعظوں اور مبلغوں نے ہی نہیں کیا، بلکہ ہمارے ان بڑے بڑے مصنفین ومؤلفین نے بھی کیا جن کی کتابیں مسلمانوں اور غیر مسلموں، دونوں کے لیے اسلام کے سمجھنے کا واحد ذریعہ تھیں۔ آپ اپنے تمام بڑے بڑے مصنفوں کی وہ کتابیں اٹھا کر دیکھئے جو اسلام پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں دوسرے انبیاء اور ان کی تعلیمات کی نسبت ایسے زہر آلود فقرے آپ کو ملیں گے جن کو پڑھ کر صاف محسوس ہوگا کہ مسلمان بھی اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنے کی اسی بیماری میں مبتلا ہو گئے ہیں جن میں یہود ونصاریٰ مبتلا ہو گئے تھے۔ لیکن مسلمانوں نے اس طرح کی کتابوں کو عزت واحترام کے ہاتھوں لیا اور اس طرح کے واعظوں کی تقریریں داد وتحسین کے ساتھ سنیں۔ کیونکہ اس سے ان کے قومی کبر وغرور کو شہ ملتی تھی۔ برعکس اس کے جن لوگوں کی تحریروں اور تقریریں میں یہ چاشنی نہیں تھی وہ نہ تو عوام میں ہی کچھ حسن قبول حاصل کر سکے، نہ خواص ہی میں ان کی کچھ وقعت ہوئی۔ اس سے انکار نہیں کہ یہ زہر آلود تبلیغی لٹریچر پیدا کرنے میں بہت کچھ دخل ان لوگوں کو بھی ہے جنھوں نے اسلام کے خلاف بدزبانیاں کی ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ بھی

مسلمانوں ہی کی غلطی ہے کہ انہوں نے شر کا جواب شر سے دے کر فتنہ انگیزیوں میں اس کے ساتھ تعاون کیا۔ ان غلطیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلموں کے دلوں میں کدورت پیدا ہوئی اور انہوں نے اسلام پر اس حیثیت سے کبھی غور نہیں کیا کہ یہ ان کو انہی کی بھلائی ہوئی سچائیوں کو یاد دلانے اور انہی کے نبیوں اور رسولوں کے ورثہ کو ان کی طرف منتقل کرنے آیا ہے، بلکہ اس کو ایک حریف اور رہزن کی طرح نفرت کی نگاہ سے دیکھا جو ان سے ان کے دین و دھرم کو چھین کر ان کے اوپر خود مسلط ہونا چاہتا ہے۔

دوسری غلطی

اسلام کو پیش کرنے میں دوسری غلطی یہ کی گی کہ اس کو بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے نہیں پیش کیا گیا جو زندگی کے سارے انفرادی و اجتماعی اور عملی اور عقائدی مسائل کو ایک وحدت میں پروتا اور سب کو عقل و فطرت کے مطابق حل کرتا ہے، بلکہ سارا زور ہمارے مبلغوں اور مناظروں نے چند ایسے مسائل پر صرف کیا جو عیسائیوں یا ہندوؤں کے ساتھ مذہبی تصادم سے پیدا ہو گئے تھے۔ مثلاً روح اور مادہ کے حدوث وقدم کی بحث، تناسخ کا مسئلہ، الوہیت مسیح اور تثلیث کا جھگڑا وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے مسائل سے ہر فرقہ کے تھوڑے سے پیشہ ور مناظروں کو دلچسپی ہوتی ہے جن کی اصلی کامیابی ان کے حل کرنے میں نہیں، بلکہ ان کو زیادہ سے زیادہ الجھا دینے میں ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کرنا اپنی قوت و قابلیت کو ضائع کرنا اور اپنے وقت کو برباد کرنا ہے۔ لیکن ہمارے مبلغین نے زیادہ تر اسی طرح کے معرکوں میں زندگیاں بسر کر ڈالیں۔ انہیں اس بات پر غور کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی کہ یہ مسائل تو صرف چند مناظرہ بازوں کی دلچسپی کے ہیں جو ان کو حل کرنا نہیں چاہتے، بلکہ الجھانا چاہتے ہیں۔ باقی ساری دنیا کے سامنے تو آج بالکل دوسرے ہی مسائل ہیں جن کے حل کرنے کے لیے دنیا بے چین بھی ہے اور جن کے حل ہونے ہی پر دنیا کی نجات کا انحصار بھی ہے۔ جو مذہب بھی آگے بڑھ کر ان مسائل کا قابل قبول حل پیش کر دے گا وہی

ساری دنیا کا مذہب بن سکے گا۔ ایک ایسی دنیا میں جو اپنے ایجاد کیے ہوئے طریقوں کو آزما کر تھک چکی ہو۔ اور زندگی کے تمدنی و اجتماعی مسائل کا کوئی حل نہ پا رہی ہو، اگر اسلام کو محض چند عقائد اور چند رسوم کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک مکمل نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تو آج دنیا کا نقشہ ہی بدل جاتا۔ لیکن ہمارے اندر سے جو حضرات تبلیغ اسلام کا مقصد لے کر اٹھے یا جنھوں نے اسلام پر کتابیں لکھیں شاید ان کے سامنے مذہب کا مسیحی تصور تھا کہ یہ چند ادعانیات کا مجموعہ ہے، زندگی کے عملی مسائل سے اس کو کوئی اثباتی تعلق نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح مسیحیت کی لایعنی موشگافیوں سے دنیا کے ذہین طبقہ نے کوئی دلچسپی نہیں لی اسی طرح اسلام کے ان مسائل کی طرف بھی پڑھی لکھی دنیا نے کوئی توجہ نہیں کی اور تبلیغ اسلام کی یہ ساری ہماہمی، رسمی مذہبیت کے تھوڑے سے پرستاروں کے اندر محدود ہو کر رہ گئی۔ اضاعت وقت و مال کے سوا اس کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا۔

تیسری غلطی

اس سلسلہ کی تیسری عملی غلطی یہ ہے کہ ہماری زبان میں اب تک اسلام پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ یا تو خالص اکیڈمک قسم کی چیزیں ہیں، یا مناظرانہ طرز کی، یا معذرت خواہانہ انداز کی ہیں، یا پھر متکلمانہ بحث و استدلال کے رنگ میں ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی نافع نہیں ہے۔ علمی بحثیں ان لوگوں کے لیے بے شک مفید ہیں جو اسلام کے اس خاص پہلو پر بصیرت حاصل کرنا چاہتے ہوں جس پہلو سے وہ بحث متعلق ہے، لیکن دعوت و تبلیغ کے لیے نہ وہ لکھی ہی جاتی ہیں نہ اس مقصد کے لیے ان کے اندر کوئی صلاحیت اور کشش ہی ہوتی ہے۔ مناظرانہ طرز کی چیزیں اوّلاً تو، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، چند مخصوص قسم کے مسائل پر ہیں جن سے اسلام کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ ثانیاً ان کے اندر وہ تمام خرابیاں موجود ہیں جو دلوں کو اسلام سے قریب کرنے کے بجائے دور کرنے والی ہیں۔ معذرت خواہانہ انداز کی چیزوں سے ہمارا اشارہ حضرات کی مذہبی تصنیفات کی طرف ہے جو یورپ سے مرعوب تھے۔ جو چیز

اہل یورپ کے ہاں ممدوح قرار پا گئی ان حضرات نے کوشش کی کہ اس کا وجود اسلام میں بھی ثابت کر دیں، اگر چہ اسلام اس سے ہزاروں کوس دور ہو۔ اسی طرح جو چیز ان کے ہاں مردود قرار دے دی گئی اس کے انکار کے دلائل ان حضرات نے بھی جمع کرنے شروع کر دیے، اگر چہ وہ چیز اسلام کے ارکان واصول میں داخل ہو۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی کمزور اور منفعل ذہنیت کے لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے نہ تو وہ اسلام کی صحیح ترجمانی ہے اور نہ اس اندر وہ داعیانہ اذعان ویقین ہی ہے جو دلوں کو کھینچتا اور دماغوں کو اپیل کرتا ہے۔ متکلمانہ طرز پر جو چیزیں لکھی گئی وہ ان سب سے زیادہ مایوس کن ہیں۔ متکلمین کا طرز استدل عقل وفطرت سے بعید تر ہے۔ اس سے کسی مسئلہ کی گرہوں میں اضافہ تو کیا جا سکتا ہے، لیکن کسی گرہ کو کھولا نہیں جا سکتا۔ یہ طرز استدلال صرف کج بحثیوں کے لیے موزوں ہے۔ اس کے اندر تو دل نشینی ہے، نہ کشش ہے، نہ یہ عقل سلیم اور فطرت انسانی سے کوئی موافقت رکھتا ہے۔ اس کو اسلام کے پیش کرنے کا ذریعہ بنانا لوگوں کو اسلام سے متنفر اور بدگمان کرنا ہے۔ اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا واحد طریقہ وہی تھا جو اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول نے اختیار کیا۔ لیکن ہمارے متکلمین یونانیوں کے فلسفہ سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ انہوں نے قرآن کے طرز استدلال کی طرف نہ صرف یہ کہ کوئی توجہ نہیں کی، بلکہ الٹا اس کو مطعون کیا اور حقیر ٹھہرایا۔ یہ غلطی ہمارے پرانے متکلمین نے بھی کی اور اسی غلطی کے مرتکب ہمارے نئے متکلمین بھی ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلموں پر، اسلام کی حجت تمام کرنا تو الگ رہا خود پڑھے لکھے وہ مسلمان بھی، جو مسلمان باقی رہنا چاہتے ہیں یا کم از کم اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرانا چاہتے ہیں، یہ کہنے لگے کہ اسلام بس دل سے مان لینے کی چیز ہے، عقل سے سمجھنے کی چیز نہیں ہے ـــــ اور جو جری اور بے باک ہیں انہوں نے علانیہ مذاق اڑانا شروع کر دیا اور نام کے سوا ہر چیز میں وہ اسلام سے بالکل آزاد ہو گئے۔

مروجہ طریقہ تبلیغ کی عملی غلطیاں

مروجہ طریقہ تبلیغ میں عملی پہلوؤں سے بھی کچھ کم غلطیاں نہیں ہیں۔ ان میں سے بھی بعض کی طرف ہم اشارہ کریں گے۔

پہلی غلطی

پہلی عملی غلطی مسلمانوں کی شترگربگی ہے۔ شترگربگی سے مطلب یہ ہے کہ ایک طرف یہ اصولی جماعت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جس کی تعمیر اسلام اور ایمان کے اصولوں پر ہوئی ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ اس طرح کی تمام خصوصیات بھی اپنے اندر جمع کیے ہوئے ہیں جس طرح کی خصوصیات نسل ونسب یا وطن کے اشتراک یا تہذیب و معاشرت کی یکسانی سے پیدا ہونے والی ایک قوم میں پائی جاتی ہوں۔ ایک طرف تو یہ کہتے ہیں کہ مسلمان وہ ہے جو اللہ پر، اس کی کتابوں پر، یوم آخرت پر ایمان لائے اور معیشت و معاشرت اور اخلاق وعمل کے سارے گوشوں میں اللہ اور اس کے رسولوں کے بتائے طریقوں کا پابند ہو۔ دوسری طرف بے شمار ایسے انسان بھی ان کے اندر شامل ہیں جو بجز اس کے کہ کسی مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں اور کسی طرح کا بھی اشتراک ان کے ساتھ نہیں رکھتے ——— ایک طرف تو یہ مدعی ہیں کہ زندگی کے ہر شعبہ میں، ان کے ہادی اور رہنما محمد، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ دوسری طرف انہوں نے اپنی قیادت کی باگیں ان لوگوں کے سپرد کر رکھی ہیں جو علم وعمل، دونوں میں رسول اللہ کی ہدایات سے بے نیاز ہیں۔ ایک طرف تو یہ اخلاق وعمل کا ایک پورا نظام پیش کرتے اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ان سے منحرف ہو کر کوئی شخص مسلمان باقی نہیں رہ سکتا، دوسری طرف بداخلاقی اور بدعملی کی جتنی قسمیں دوسری قوموں

کے اندر پائی جاتی ہیں ان سب کے نمونے وہ خود پیش کرتے ہیں اور اس سے ان کی اسلامیت میں کوئی خرابی نہیں پیدا ہوتی۔ ایک طرف تو یہ اپنی ساری وابستگی ایک نظامِ حق کے ساتھ دکھاتے ہیں اور مدعی ہیں کہ اس سے سرمو انحراف جائز نہیں ہے۔ لیکن دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر مصطفیٰ کمال تک کی پوری تاریخ کو اسلامی تاریخ بتاتے ہیں جس کا ایک بڑا حصہ اسلام کے نظامِ حق سے کوئی ادنیٰ مناسبت بھی نہیں رکھتا۔ ایک طرف تو یہ مدعی ہیں کہ اسلام خود ایک مکمل نظامِ زندگی ہے اور آج اگر دنیا کی نجات کسی چیز میں ہے تو بس اس نظام کو اختیار کر لینے ہی میں ہے۔ لیکن دوسری طرف حال یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کا طواف کرتے پھر رہے ہیں کہ معلوم کریں کہ انگریزوں کا نظام زیادہ اسلامی ہے یا امریکیوں کا؟

اپنی یہ دورنگی، چاہے مسلمان خود محسوس نہ کرتے ہوں، لیکن دوسری قومیں کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کے اس تضاد کو محسوس نہ کریں۔ وہ لازمی طور پر مسلمانوں کے قول وعمل کے اس تضاد کو دیکھ کر حیران ہوتی ہیں اور ان میں اگر کسی اللہ کے بندے کو توفیق الٰہی سے اسلام کی طرف کشش بھی ہوتی ہے تو یہ دیکھ کر رک جاتا ہے کہ مسلمان تو اسی طرح کی ایک قوم ہے جس طرح کی قوم خود اس کی اپنی ہے، پھر ایک قوم کو چھوڑ کر بالکل اسی طرح کی قوم میں داخل ہونے کے کیا معنی۔ ہماری اس دورنگی کے باوجود اگر کوئی نیک دل غیر مسلم اسلام لاتا ہے تو یقین کرنا چاہیے کہ وہ ہماری دعوت کی وجہ سے اسلام نہیں لاتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ اس پر اس کے دین کی غلطی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا غلط ہونا بھی واضح کر دیتا ہے۔ وہ اسلام کو مسلمانوں سے بالکل الگ کر کے دیکھتا ہے۔ ورنہ ان لوگوں کی تبلیغ سے کوئی شخص کیا متاثر ہو سکتا ہے جن کے بے اصولے پن کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ایک بزرگ اشاعت علم دین کے لیے ایک ادارہ قائم کرتے ہیں، اس مقصد کے لیے مسلمانوں سے روپیہ وصول کر کے سود پر چلاتے ہیں، خود ایک ہندو یا عیسائی تبلیغی کالج میں نوکر ہیں اور اپنے صاحب زادے کو

کسی آریہ یا مشن کالج میں تعلیم دلا رہے ہیں۔[1]

دوسری غلطی

دوسری علمی غلطی یہ ہے کہ مسلمانوں نے بھی شاید مسیحی مشنریوں کی دیکھا دیکھی ہمیشہ تبلیغ کے لیے پست حال طبقوں ہی پر نظر رکھی، حالانکہ یہ طریقہ بالکل غلط ہے۔ تبلیغ میں اوّل خطاب ان طبقات سے ہونا چاہیے جن کے افکار و نظریات کی قیادت میں سوسائٹی کا نظام چل رہا ہو۔ یہی لوگ دراصل کسی قوم کو بناتے یا بگاڑتے ہیں۔ اگر یہ راہِ راست پر آ جائیں تو سارا نظام آپ سے آپ راہِ راست پر آ جاتا ہے اور اگر یہ بگڑے ہوئے رہیں تو اوّلاً تو نیچے کے طبقات میں کوئی اصلاح واقع ہوتی ہی نہیں اور اگر ہوتی بھی ہے تو وہ بالکل عارضی ہوتی ہے۔ ان کا منفعل مزاج بہت جلد ان خرابیوں کو پھر قبول کر لیتا ہے جن کا دباؤ اوپر کے مؤثر اور عامل طبقہ کی طرف سے پڑتا ہے۔ اس کی مثال بالکل قلب اور اعضاء و جوارح کی ہے۔ اگر قلب کی اصلاح ہو جائے تو سارا جسم خود بخود تندرست ہو جاتا ہے اور اگر دل میں بیماری موجود ہے تو اعضاء و جوارح پر روغن کی مالش اور ضماد سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ عیسائی مشنریوں کے سامنے صرف اپنی تعداد بڑھانے کا سوال تھا۔ اس وجہ سے ان کے لیے تو یہ تدبیر مفید ہو سکتی ہے، لیکن مسلمانوں کے لیے صرف اضافہ تعداد کے خیال سے تبلیغ کرنا جائز نہیں ہے۔ ان کو تو اللہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہِ راست پر لانا اور ان کی زندگیوں کو ہر پہلو سے سنوارنا ہے۔ اس طرح کا سنوارنا اسی وقت ممکن ہے جب پورا ماحول سنورے اور پورے ماحول کا سنورنا صرف اس صورت میں متوقع ہے جب سوسائٹی کا ذہین اور کارفرما طبقہ اصلاح قبول کرے۔ جو لوگ اجتماعیات پر تھوڑی بہت نظر رکھتے ہیں وہ اس حقیقت

---

[1] جس وقت یہ مضمون لکھا گیا تھا اس وقت پیشِ نظر مشرقی پنجاب کے ایک خاص بزرگ تھے۔ اب ع آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔ خیال ہوا کہ اب اس حصہ کو حذف کر دیا جائے، لیکن چونکہ مسلمانوں کی عام حالت یہی ہے اس وجہ سے اس کو رہنے دیا گیا۔ البتہ اب اس کو ایک خاص تلمیح کے بجائے ایک عام تمثیل سمجھیے۔

سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہنگامی اور انقلابی تحریکیں تو نیچے سے چل کر اوپر کے نظام کو درہم برہم کر ڈالتی ہیں، لیکن ٹھوس اصلاحی اور عقلی دعوتیں اسی وقت جڑ پکڑا کرتی ہیں جب اوپر سے نیچے کی طرف اثر انداز ہوں۔ مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے دعوتِ دین کا کوئی کام کیا، خواہ مسلمانوں کے اندر یا ان سے باہر، انہوں نے بالعموم یہ غلطی کی کہ اپنی نظر ہمیشہ پست حال طبقوں ہی پر رکھی اور ان کو کلمہ پڑھا کر یا نماز سکھا کر انہوں نے سمجھا کہ بس اب ان کی اصلاح ہوگئی۔ بے شبہ اس طرح سے بعض جزئی اصلاحیں تو ہوجایا کرتی ہیں، لیکن اس طرح زندگی بحیثیت مجموعی نہ تو تبدیلی قبول کرتی ہے اور نہ کرسکتی ہے۔ جب آب و ہوا بحیثیت مجموعی خراب ہوتو مریضوں کے علاج سے زیادہ اسبابِ مرض کے استیصال کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان گندے نالوں کو بھرنا چاہیے جو جراثیم کو پھیلاتے اور ہوا کو خراب کررہے ہیں۔ اس کے بغیر جو اصلاح ہوگی اس کی مثال بالکل ایسے ہے کہ رہے تو ایک شخص ایسے مقام پر جہاں طاعون یا ہیضہ کی وبا پھیلی ہوئی ہے، لیکن اس کو ٹیکہ لگا دیا جائے، یہ ٹیکہ عارضی طور پر ممکن ہے مفسد اثرات کا مقابلہ کرلے لیکن تا کجے۔ یہ وجہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام نے، جیسا کہ آگے چل کر تفصیل سے معلوم ہوگا، کبھی عام لوگوں کو پہلے خطاب نہیں فرمایا، بلکہ سوسائٹی کے کارفرما عناصر کی ذہنیتوں کو تبدیل کرنے کی کوشش فرمائی۔ اور ان کی اصلاح کو عوام کی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔

تیسری غلطی

تیسری عملی غلطی یہ ہے کہ مسلمانوں نے تبلیغ کا ذریعہ صرف الفاظ کو بنایا، حقیقی اسلامی زندگی کا عملی مظاہرہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ مجرد اسلام کے اصولوں کی خوبی کی وجہ سے تو صرف تھوڑے سے ذہین اور غیر معمولی اخلاقی جرأت رکھنے والے لوگ ہی ایمان لا سکتے ہیں۔ دنیا کا بڑا حصہ تو اسی وقت ان اصولوں کی سچائی کا اقرار کرے گا جب عملی زندگی کے اندر ان کو ابھرتا اور اچھے نتائج پیدا کرتا ہوا دیکھے گا۔ لیکن ہمارے یہاں عرصہ سے تبلیغ

اسلام کے نام سے جو جدوجہد کی گئی ہے اس کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ خوش بیان واعظوں، پرجوش مبلغوں اور انشاپرداز مصنفوں نے دنیا کو اسلامی زندگی کی خیالی فردوس کی سیر کرائی ہے اور لطف یہ کہ ایک طرف یہ حضرات اسلام کی تمدنی واجتماعی برکات کی تعریف میں آسمان وزمین کے قلابے ملاتے رہے ہیں، دوسری طرف پوری اسلامی سوسائٹی، اپنے اندر تمام مفاسد جاہلیت کو لیے ہوئے ان کے دعادی کی تکذیب کرتی رہی ہے۔ عمل کی خاموش زبان دعویٰ کی ناطق زبان سے زیادہ مؤثر ہے۔ اس وجہ سے یہ سارے وعظ فضا میں گم ہو گئے اور دنیا ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اگر مجرد لفاظی کے بجائے خدا کے کچھ بندوں نے اس بات کی کوشش کی ہوتی کہ جن اصولوں پر وہ ایمان لائے ہیں انہی اصولوں پر ایک سوسائٹی کی تعمیر کریں تو اس کوشش میں ناکام ہو کر بھی وہ دعوتِ اسلام کی اس سے بدرجہا شاندار خدمت انجام دے سکتے جو اپنے وعظوں اور لیکچروں میں کامیاب ہو کر بھی وہ انجام نہ دے سکے۔ اسلام کی ساری دنیا کے لیے خیر و برکت ثابت کرنے کے لیے نہ تنہا یہ چیز کافی ہو سکتی کہ عہد ماضی کے کچھ اثر انگیز واقعات لوگوں کو سنا دیے جائیں اور نہ یہ بات کچھ مفید ہے کہ اس کے عقلی امکانات پر مضامین لکھے جائیں اور تقریریں کی جائیں۔ اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسلام کے اصولوں پر ایمان لانے والی جماعت اجتماعی صورت میں ان اصولوں کا مظاہرہ کرے۔ افسوس ہے کہ سب کچھ ہوا مگر یہی بات نہیں ہوئی۔

چوتھی غلطی

چوتھی عملی غلطی یہ ہے کہ مسلمانوں نے بھی تبلیغ دین کے لیے اسی طرح کے بعض اوچھے طریقے اختیار کیے جس طرح کے اوچھے طریقے عیسائی مشنری یا آریے استعمال کرتے رہے ہیں۔ عیسائیوں نے دنیا کے گرے ہوئے طبقات کو جن لالچوں اور ہتھکنڈوں سے عیسائی بنایا انہی طریقوں کو مسلمانوں نے اپنانا چاہا۔ جو ہتھکنڈے اپنے مقصد کے لیے

آریے استعمال کرتے رہتے ہیں مسلمان بھی بے تکلف ان کے استعمال کرنے پر اتر آئے۔ مناظروں میں جو زبان درازیاں، جو کج بحثیاں اور جو دھینگا مشتیاں دوسروں نے کیں مسلمانوں نے بھی ان میں کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہا۔ مسلمانوں میں سے کوئی شخص کسی لالچ میں آکر یا کسی غلط فہمی میں پڑکر آریہ ہوگیا تو آریوں نے اپنی فتح کا ٹنکا بجایا۔ اسی طرح اگر کسی ہندو نے کہیں اسلام کا اظہار کر دیا تو مسلمانوں نے اس کو آسمان پر چڑھانے کی کوشش کی۔ نادان بچوں کو بہکانا اور بھگا لے جانا جس طرح دوسروں کے یہاں اشاعت دین کے پروگرام کا ایک اہم جزو تھا اسی طرح مسلمان بھی ان چیزوں کو جائز سمجھنے لگ گئے۔ اگر نفس کے ہیجان کی وجہ سے کوئی ہندو عورت کسی بے قید مسلمان کے ساتھ بھاگ کھڑی ہوئی تو اس کو ایک عظیم الشان تبلیغی فتح سمجھا گیا اور اس طرح کی بے حیائی اور آوارگی بھی نصرت دین میں داخل ہوگئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی بداخلاق عورتوں اور بہت سے آوارہ مردوں نے تبدیل دین کو ایک پیشہ بنالیا۔ صبح کو وہ اسلام کا اعلان کر کے مسلمانوں کے کندھوں پر سوار ہوتے اور شام کو اپنے آریہ یا عیسائی ہونے کا اعلان کر کے آریوں یا عیسائیوں سے روپے اینٹھتے۔ جس زمانہ میں ہندوستان کے بعض علاقوں میں شدھی سنگھٹن کا زور تھا ایک بزرگ نے دلّی کی ''مسلمان رنڈیوں'' سے بھی اپیل کی تھی کہ وہ اپنے غیر مسلم آشناؤں پر تبلیغ اسلام کیا کریں۔ ان حرکتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلموں کی نظروں میں اسلام بالکل بے وقعت ہو کے رہ گیا۔ وہ یہ سمجھنے لگ گئے کہ یہ بھی دنیا کا ایک کاروبار اور محض اپنی قوم کی تعداد بڑھانے کا ایک ذریعہ ہے جس کو عوام فریبی کے لیے مسلمان اللہ کے دین کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ یہ سمجھنے میں وہ بالکل حق بجانب تھے کیونکہ جس مقصد سے اور جن طریقوں سے وہ اپنے دین کو استعمال کر رہے تھے جب اسی مقصد اور انہی طریقوں سے بالکل حرف بحرف مسلمانوں نے بھی اسلام کو استعمال کیا تو آخر ان کے دلوں پر اسلام کی برتری کا سکہ کیسے جمتا؟

پانچویں غلطی

پانچویں عملی غلطی یہ ہے کہ اس زمانہ میں چاہے کسی اور کام کے لیے مسلمان کسی قابلیت کی ضرورت سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں مگر دو کاموں کے لیے وہ سرے سے کسی قابلیت کی ضرورت نہیں سمجھتے، ایک امامت مسجد، دوسرا تبلیغ دین۔ ایک وہ زمانہ تھا جب نماز کی امامت یا تو امیر اسلام کرتا تھا یا وہ شخص جس کو امیر اسلام اس کام پر مقرر کرے یا اب زمانہ یہ ہے کہ جو شخص دنیا کا کوئی کام انجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا مسلمان اس کو اپنی مسجدوں کی امامت کے لیے ڈھونڈتے ہیں۔ ایک مبارک زمانہ وہ تھا جب ہر مسلمان یہ سمجھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو برپا ہی اس لیے کیا ہے کہ خدا کے رسول نے دین حق جس احساس ذمہ داری، جس سرگرمی اور جس دل سوزی کے ساتھ ان کو پہنچایا ہے، اسی احساس ذمہ داری، اسی سرگرمی اور اسی دل سوزی کے ساتھ یہ دوسروں کو پہنچائیں اور اسلامی خلافت اپنے تمام شعبوں اور اپنے تمام اعلیٰ سے اعلیٰ کارکنوں سمیت صرف اسی فریضہ رسالت کی ادائیگی کا ایک ذریعہ تھی جو اللہ کے رسول کی طرف سے اس امت کی طرف منتقل ہوا تھا۔ یا اب یہ حال ہے کہ پوری اسلامی سوسائٹی تو اپنے تمام ذہین اور کارفرما افراد اور طبقات کے ساتھ ایک جاہلی نظام کی خدمت میں لگی ہوئی ہے، البتہ خدا کے بعض نیک بندوں کو کبھی کبھی یہ خیال بھی ہو جایا کرتا ہے کہ تبلیغ اسلام بھی ایک نیک کام ہے۔ وہ مسلمانوں سے کچھ پیسے اکٹھا کر کے چند تنخواہ دار ملازمین تبلیغ اسلام کے لیے مقرر کر دیتے ہیں۔ ان ملازمین میں سب سے بڑی صفت جو تلاش کی جاتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کے متعلق کچھ الٹی سیدھی معلومات رکھتے ہوں اور مناظرہ اور تقریر کر سکتے ہوں۔ یہی لوگ کچھ تقریر اور مناظرہ کی مشق بہم پہنچا کر کچھ ادھر ادھر سے اسلام اور دوسرے مذاہب کے متعلق بے ربط معلومات فراہم کر کے کسی انجمن کی طرف سے تبلیغ اسلام شروع کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ نہ اسلام سے واقف ہوتے ہیں نہ دوسرے مذاہب کی انہیں کچھ خبر ہوتی ہے اور نہ ان کے اندر اسلامی

سیرت ہی کا کوئی پرتو ہوتا ہے۔بس بڑے سے بڑا وصف جوان میں ہوتا ہے وہ زبان درازی اور مناظرہ بازی ہے۔اور جو تبلیغ اسلام محض زبان درازی اور مناظرہ بازی کے بل پر ہوگی اس کا نتیجہ معلوم ہے۔

مروجہ طریقہ تبلیغ کی ان بعض موٹی موٹی علمی و عملی غلطیوں کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔اگراس کا اچھی طرح تجزیہ کر کے اس کو دیکھا جائے تو اس کے بہت سے پہلو بھی قابل اعتراض نظر آئیں گے۔لیکن ہم اس سے زیادہ اس بحث کو طویل نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارا مقصود ان باتوں کے ذکر کرنے سے یہ ہے کہ آج جس چیز کو ہم تبلیغ کہتے ہیں اس تبلیغ کو اس تبلیغ سے کوئی دور کی نسبت بھی نہیں ہے جو تبلیغ انبیائے کرام نے کی ہے۔نہ اس تبلیغ کا مقصد ہی وہ ہے جو انبیائے کرام نے اپنے سامنے رکھا تھا اور نہ اس کا طریقہ کار ہی وہ ہے جو انہوں نے اختیار فرمایا تھا۔ اس کے مقصد اور طریقہ کار، دونوں چیزوں میں دوسری غیر مسلم جماعتوں کی نقالی سرایت کر گئی ہے۔اس وجہ سے ہم تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتے ہیں کہ حضرات انبیائے کرام نے کس مقصد کے لیے تبلیغ کی، کس طرح تبلیغ کی، اس کے لیے کیا کیا وسائل و ذرائع اور کیا کیا طریقے اختیار فرمائے، ان کو اس کی راہ میں کیا کیا مرحلے پیش آئے اور ہر مرحلہ کے تقاضوں اور اس کی ذمہ داریوں کو انہوں نے کس طرح پورا کیا اور ان کی اس جدوجہد سے دنیا میں کیا کیا برکتیں ظہور میں آئیں۔

باب ۲

تبلیغ کس لیے

انبیاء کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر نیکی اور بدی کے پہچاننے کی قابلیت اور نیکی کے اختیار کرنے اور بدی سے بچنے کی خواہش ودیعت کردی ہے۔ اس پہلو سے انسان ایک اعلیٰ خلقت اور ایک بلند فطرت لے کر دنیا میں آیا ہے اور اس بات کا اہل ہے کہ اپنی سمجھ سے نیکی کو پسند اور بدی کو ناپسند کر کے اللہ تعالیٰ کے یہاں انعام کا مستحق ہو اور اگر اپنی فطرت کے خلاف خیر کی جگہ شر کا راستہ اختیار کرے تو فاطر کی طرف سے اپنی اس خلافِ فطرت روش پر سزا پائے۔ لیکن اگر ایک طرف اس کی فطرت میں یہ پہلو خوبی اور کمال کا ہے تو دوسری طرف بعض اعتبارات میں خلا اور نقص بھی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نہ دنیا میں انسان کی ہدایت و ضلالت کے معاملہ کو تنہا اس کی فطرت پر چھوڑا نہ آخرت میں اس کو جزا و سزا دینے کے لیے اس فطری رہنمائی کو کافی قرار دیا۔ بلکہ فطرت کے مقتضیات اور اس کی مخفی قابلیتوں کو آشکارا کرنے اور خلق پر اپنی حجت تمام کرنے کے لیے اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا تاکہ قیامت کے دن لوگ یہ عذر نہ کرسکیں کہ ان کو نیکی اور سچائی کا راستہ معلوم نہیں تھا اس وجہ سے وہ گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتے رہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید کی ان آیتوں میں واضح کیا گیا ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ

الرُّسُلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿١٦٥﴾ (النساء ۴:۱۶۵)

''اللہ نے رسولوں کو خوشخبری دینے والے اور ہوشیار کرنے والے بنا کر بھیجا تا کہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اللہ غالب اور حکیم ہے۔''

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّ لَا نَذِيْرٍ ؗ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٩﴾ (المائدۃ ۵:۱۹)

''اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول، رسولوں کے ایک وقفے کے بعد، تمہارے لیے دین واضح کرتا ہوا آ گیا ہے۔ مبادا تم کہو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا ہوشیار کرنے والا تو آیا ہی نہیں۔ دیکھ لو، ایک بشیر و نذیر تمہارے پاس آ گیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

انبیاء کے باب میں قانونِ الٰہی

اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں اپنے ہادی اور رسول بھیجے اور محض اس لیے کہ لوگوں پر حق پوری طرح آشکارا ہو جائے، کج روی اور گمراہی پر باقی رہنے کے لیے لوگوں کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے، انبیاء کے بارے میں قانون الٰہی یہ رہا ہے کہ وہ سب کے سب بلا استثناء انسانوں میں سے آئے، فرشتوں یا جنوں میں سے نہیں آئے۔ تا کہ انسانوں پر انسانی فطرت کے تقاضے انسانوں ہی کے ذریعہ سے واضح کیے جائیں اور لوگوں کے لیے یہ کہنے کا موقع باقی نہ رہے کہ انسان کے لیے کسی غیر انسان کا علم و عمل کیسے نمونہ کا کام دے سکتا ہے۔ اسی طرح بعض مستثنیٰ مثالوں کے سوا، ہر قوم کے اندر، اللہ تعالیٰ نے اسی قوم کے اندر سے رسول بھیجے تا کہ قومی اجنبیت لوگوں کے لیے قبول حق میں مانع نہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس ہر قوم کے لوگوں پر، اللہ کے رسولوں نے انہی کی زبان میں حق کی تبلیغ کی تا کہ لوگوں پر حق اچھی طرح واضح ہو سکے اور زبان بھی صاف ستھری، اینچ پیچ سے بالکل پاک اور

سب کے فہم سے قریب تر اور دل نشین استعمال کی۔ پھر اللہ کے ان رسولوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ لوگوں کو ایک مرتبہ حق کی طرف پکار دیا ہو، بلکہ اپنی پوری زندگیاں اسی مقصد میں لگا دیں اور جن باتوں کی دوسروں کو دعوت دی ان کو خود بھی کر کے دکھا دیا اور ان کے ساتھیوں نے بھی اپنی عملی زندگی میں ان کا مظاہرہ کیا۔ یہ سارا اہتمام محض اس غرض کے لیے کیا گیا کہ خلق کو خالق کی رضا حاصل کرنے اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جو کچھ جاننا چاہیے اس کے بتانے میں کسی پہلو سے کوئی کسر نہ رہ جائے اور لوگ قیامت کے دن اپنی شرارتوں اور بدعملیوں کا الزام اللہ سبحانہ تعالیٰ پہ نہ ڈال سکیں۔

خاتم الانبیاء کی بعثت

جب تک دنیا نے تمدنی و اجتماعی زندگی کے وہ وسائل نہیں پیدا کر لے جو ساری دنیا کو ایک داعی حق کی دعوت پر جمع کرنے کے لیے ضروری تھے اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے الگ الگ قوموں کے اندر رسولوں کا بھیجنا جاری رکھا۔ لیکن جب انبیاء کی تعلیم و تربیت سے قوموں کا اخلاقی و اجتماعی شعور اتنا بیدار ہو گیا کہ وہ ایک عالمگیر نظامِ عدل کے تحت زندگی بسر کر سکیں اور ساتھ ہی دنیا کے مادی وسائل اجتماع و تمدن نے بھی اس حد تک ترقی کر لی کہ ایک ہادی کا پیغام ہدایت دنیا کے ہر گوشے میں بسہولت پہنچ سکے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ وہ خاتم الانبیاء ''محمد'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجے اور ان کے ذریعے سے لوگوں کو وہ مکمل نظامِ زندگی عنایت فرمائے جو تمام بنی نوع انسان کے مزاج اور ان کے حالات و ضروریات کے بالکل مطابق ہو۔ یہی خدائی نظامِ زندگی ہے جس کو ہم اسلام کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ اپنی روح کے اعتبار سے وہی دین ہے جس کو تمام انبیاء لے کر آئے۔ صرف بعض اعتبارات سے یہ ان سے مختلف ہے۔ پہلے انبیاء نے عقائد کی تعلیم اپنی قوموں کی استعداد کے لحاظ سے دی تھی، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد کی تعلیم اس معیار فہم کے لحاظ سے دی جو اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو عطا فرمایا ہے۔ دوسرے انبیاء نے جن قوانین

کی تعلیم دی ان میں ان کی قوموں کے خاص مزاج اور ان کے خاص خاص امراض کی بھی رعایت تھی، لیکن اسلام کے قوانین میں کسی خاص قومی اور جماعتی مزاج ورجحان کے لحاظ کی بجائے صرف مزاج انسانی کا لحاظ ہے۔ دوسرے انبیاء کو جو نظامِ زندگی خدا کی طرف سے عطا ہوا وہ صرف ان کی قوموں کی ضروریات کے اعتبار سے تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے جو نظامِ زندگی دنیا کو ملا وہ صرف کسی خاص قوم ہی کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا بلکہ بنی نوع انسان کی تمام انفرادی واجتماعی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے دو پہلو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ تمام عالم کی ہدایت ورہنمائی اور تمام مخلوق پر اتمامِ حجت کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی اور آپ کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ ایک بعثت خاص، دوسری بعثت عام۔

آپ کی بعثت خاص اہل عرب کی طرف تھی اور اہل عرب کے ساتھ اسی خاص نسبت کی وجہ سے آپ کو نبی امی یا نبی عربی کہا گیا اور آپ پر جو وحی نازل ہوئی اس کی زبان بھی عربی ہوئی۔ اس بعثت کی ذمہ داریاں ـــــ یعنی تبلیغ اور اتمام حجت ـــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے براہِ راست انجام دیں۔

آپ کی بعثت عام تمام دنیا کی طرف ہے۔ اس بعثت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک امت عطا فرمائی اور اس امت کو یہ حکم دیا کہ رسول نے جس دین کی تبلیغ تم پر کی ہے اس کی تبلیغ اسی طرح تم دوسروں پر کرتے رہنا:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرة ۲: ۱۴۳)

"اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔"

وَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَکُمۡ بِہٖ وَ مَنۡۢ بَلَغَ ؕ (الانعام ۶:۱۹)

"اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے کہ میں بھی اس کے ذریعہ سے تم کو ڈراؤں اور وہ بھی جن کو یہ پہنچے۔"

دین کی حفاظت کے لیے دو خاص انتظام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عام کے مقصد کی تکمیل کے لیے ایک پوری امت کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے برپا کیا تاکہ ہر ملک، ہر قوم اور ہر بولی میں یہ دعوتِ حق قیامت تک بلند ہوتی رہے اور دنیا الگ الگ نبیوں کی بعثت اور الگ الگ زبانوں میں وحی کے اترنے کی ضرورت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بے نیاز ہو جائے۔ چونکہ آپ کے بعد اب کسی اور نبی کی بعثت ہونے والی نہیں تھی، خلق کی رہنمائی اور اتمامِ حجت کی پوری ذمہ داری ہمیشہ کے لیے آپ کی امت پر ڈال دی گئی تھی، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دین کو صحیح حالت میں محفوظ رکھنے کے لیے دو خاص انتظام فرمائے۔ ایک یہ کہ قرآن مجید کو ہر قسم کی کمی بیشی اور تحریف و تبدیلی سے محفوظ فرما دیا تاکہ دنیا کو اللہ کی ہدایت معلوم کرنے کے لیے کسی نئے نبی کی ضرورت باقی نہ رہے۔

دوسرا یہ کہ اس امت کے اندر، جیسا کہ صحیح حدیثوں میں وارد ہے، ہمیشہ کے لیے ایک گروہ کو حق پر قائم کر دیا تاکہ جو لوگ حق کے طالب ہوں ان کے لیے ان کا علم و عمل شمعِ راہ کا کام دیتا ہے۔

اس طرح کی ایک جماعت ——— اگرچہ اس کی تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو ——— اس امت میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ فتنوں کا کتنا ہی زور ہو، لیکن یہ صالح جماعت[1] آنحضرت

---

[1] یہاں ہمارا اشارہ "لا تزال طائفة من امتی قائمة بأمر الله، لا یضرّهم من خذلهم اوخالفهم، حتیٰ یأتیَ امر الله وهم ظاهرون علی النّاس" (صحیح مسلم: کتاب الامارة، باب ۵۳) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ اللہ کے حکم پر قائم رہے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آن پہنچے اور وہ لوگوں پر غالب رہیں گے) اور اس مفہوم کی ان متعدد روایات کی طرف ہے جو صحاح میں وارد ہیں اور جن کی صحت پر ائمہ حدیث کا اتفاق ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے عمل کو زندہ رکھے گی۔ جب ضلالت کا اثر اس امت کے رگ وریشہ میں اس طرح سرایت کر جائے گا جس طرح دیوانے کتے کے کاٹے ہوئے آدمی کے رگ وریشہ میں اس کا زہر سرایت کر جاتا ہے اس وقت بھی اللہ تعالیٰ اس امت کے ایک عضو کو اس زہر سے محفوظ رکھے گا۔ جب دنیا کا خمیرا اتنا بگڑ جائے گا کہ معروف منکر بن جائے گا اور منکر معروف بن جائے گا اور اہل بدعت کا اتنا زور ہوگا کہ معروف کے ان داعیوں کی حیثیت دنیا میں اجنبیوں اور بیگانوں کی ہو جائے گی اس وقت بھی یہ لوگ خلق کو معروف کی طرف پکارتے رہیں گے اور ہر قسم کی مخالفتوں کے باوجود لوگوں کی پیدا کی ہوئی خرابیوں کی اصلاح کی کوشش کریں گے۔ ہر دور میں اس طرح کی جماعت کو باقی رکھنے سے اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ جس طرح علم وحی کو قرآن کی صورت میں قیامت تک محفوظ کر دیا گیا ہے اسی طرح اللہ کے رسولؐ اور رسولؐ کے صحابہؓ کے علم وعمل کو اس جماعت کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا جائے اور خلق کی ہدایت اور رسول کی حجت تمام کرنے کے لیے جو روشنی مطلوب ہے وہ کبھی گل ہونے نہ پائے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں یہ لوگ پہاڑی کے چراغ ہوں گے جن سے راہ ڈھونڈنے والے رہنمائی حاصل کریں گے اور زمین کے نمک ہوں گے جن سے کوئی چیز نمکین کی جاسکے گی۔

تبلیغ بحیثیت ایک فریضۂ رسالت کے

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ شہادت علی النّاس یا تبلیغِ دین محض بطور ایک نیکی اور دینداری کے کام کے مطلوب نہیں ہے اور نہ محض مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کے لیے مطلوب ہے، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عام کا جو مقصد اس امت کے ہاتھوں پورا ہونا ہے، یہ اس کا مطالبہ ہے جو اللہ کے ہر اس بندے کو ادا کرنا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں داخل ہے۔ یہ ایک فریضۂ رسالت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس امت پر ڈالا ہے۔ اگر مسلمان اس فرض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی

کریں گے تو وہ اس فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کریں گے جس کا بار اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر ڈالا ہے اور اس کوتاہی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو خیرِ امت کے اس منصب سے محروم کر دے جس پر اس فرض کی ادائیگی کے لیے ان کو سرفراز فرمایا ہے اور ساری دنیا کی گمراہی کا وبال ان کے سر آئے، کیونکہ آج خلق پر اتمامِ حجت کا ذریعہ یہی ہیں۔ اگر یہ اتمام حجت کے فرض کو ادا نہ کریں تو دنیا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی گمراہیوں کے لیے یہ عذر کر سکتی ہے کہ تو نے جن کو شہداء علی النّاس بنایا تھا اور جن پر ہماری رہنمائی کی ذمہ داری ڈالی تھی انہوں نے ہمارے سامنے تیرے دین کی تبلیغ نہیں کی، ورنہ ہم ان ضلالتوں میں نہ پڑتے اور مسلمان اس الزام کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔

تبلیغ کے شرائط

شہادت علی النّاس یا تبلیغِ عام کی یہ ذمہ داری صرف اتنے سے ادا نہیں ہو سکتی کہ دنیا میں مسلمان نامی ایک گروہ موجود ہے خواہ وہ شہادت علی النّاس کا یہ فرض انجام دے یا نہ دے اور نہ ان الٹی سیدھی تدبیروں ہی سے ادا ہو سکتی ہے جن پر کتاب کے شروع میں ہم تنقید کر کے بتا چکے ہیں کہ ان تدبیروں سے نہ صرف یہ کہ دعوتِ حق کے مقصد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، بلکہ الٹا ان سے شدید نقصان پہنچا۔ یہ ایک نہایت اہم فریضۂ رسالت کی ادائیگی ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کو ان شرائط کے ساتھ انجام دیا جائے جن شرائط کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کو انجام دینے کا حکم دیا ہے اور جن شرائط کے ساتھ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام نے اس کو انجام دیا ہے۔ یہاں ہم ان بعض شرطوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جو اس فرض کی ادئیگی کے لیے ناگزیر ہیں۔

پہلی شرط

اس شہادت کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم جس دینِ حق کے شاہد ہیں پہلے صدقِ دل کے

ساتھ اس پر خود ایمان لائیں۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام جس حق کی دعوت دیتے تھے پہلے اس پر خود ایمان لاتے تھے، اپنے آپ کو اس حق سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (البقرۃ۲:۲۸۵)

"رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس پر اس کے رب کی جانب سے اتاری گئی اور مومنین ایمان لائے۔"

اس حق پر ایمان لانے کے بعد جو چیزیں اس کے خلاف ہوئیں خواہ وہ آباء واجداد کا دین ہو، خواہ قوم وقبیلہ کی عصبیّت ہو، خواہ اپنا شخصی اور جماعتی مفاد ہو، سب سے دست بردار ہونے کے لیے انہوں نے سب سے پہلے اپنے آپ کو پیش کیا اور ان سارے خطرات میں، جو اس ایمان کے سبب سے پیش آئے "اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ" (الاعراف۷:۱۴۳) (میں پہلا مومن ہوں) اور "اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ" (الانعام۶:۱۶۳) (میں پہلا مسلم ہوں) کہتے ہوئے انہوں نے خود چھلانگ لگائی۔ یہ نہیں ہوا کہ خود تو اس سے کنارے پر کھڑے رہے، لیکن دوسروں کو للکارا کہ تمہاری نجات اگر ہے تو بس اس میں چھلانگ لگا دینے میں ہے۔

دوسری شرط

دوسری شرط یہ ہے کہ آدمی جس حق پر ایمان لایا ہے اس کی زبان سے شہادت دے۔ جو شخص ایک حق پر ایمان لایا ہے اگر اس کو ظاہر کر سکنے کے باوجود ظاہر نہیں کرتا تو وہ 'گونگا شیطان' ہے اور قیامت کے دن اس پر حق کو چھپانے کا وہی جرم عائد ہوگا جو یہود پر عائد ہوا:

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَکْتُمُوْنَهٗ (آل عمران۳:۱۸۷)

"اور یاد کرو جب کہ اللہ نے ان لوگوں سے عہد لیا جن کو کتاب دی گئی کہ تم لوگوں کے سامنے اس کتاب کو اچھی طرح ظاہر کرنا، اسے چھپانا مت۔"

اس معاملہ میں مصلحت بینی جو کچھ بھی ہونی چاہیے وہ دراصل حق کی خاطر ہونی چاہیے کہ اس کا اظہار صحیح طریق پر، صحیح محل میں، صحیح مخاطب کے سامنے ہو، تا کہ دعوتِ حق کا تخم بارآور ہو۔ اگر آدمی حق کو نظر انداز کر کے مجرّد اپنے ذاتی مفاد کے پیشِ نظر ایک امرِ حق کے اظہار سے جی چراتا ہے یا اس سے غفلت برتتا ہے تو صرف بعض مستثنیٰ حالات ہی میں اس کی اجازت ہے۔ مثلاً یہ کہ آدمی کی جان کے لیے کوئی واقعی خطرہ ہو اور اس امر کو محسوس کرتا ہو کہ اس وقت حق کی خدمت کے نقطۂ نظر سے بھی زیادہ بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی جان بچا لے جائے۔ اس طرح کے کسی واقعی خطرہ کے بغیر اگر کوئی شخص اظہارِ حق سے جی چراتا ہے تو یا تو وہ منافق ہے یا کم از کم بے غیرت اور بے حمیّت۔

تیسری شرط

تیسری شرط یہ ہے کہ یہ شہادت صرف قول ہی سے نہ دی جائے، بلکہ عمل سے بھی دی جائے۔ اسلام میں وہ شہادت معتبر نہیں ہے جس کے ساتھ عمل کی تائید و توثیق موجود نہ ہو۔ بعض لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے اور آپ کے سامنے بسا اوقات قسمیں کھا کھا کر کہتے کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس شہادت کو تسلیم نہیں کیا، فرمایا کہ یہ لوگ منافق اور جھوٹے ہیں اور اس کے ثبوت میں ان کے اعمال و اقوال کو ان کے سامنے رکھ دیا جن سے صاف اسلام اور مسلمانوں کی بدخواہی اور حق دشمنی نمایاں تھی جو شخص ایک امر کو حق مانتا ہے اور لوگوں کو اس کی دعوت بھی دیتا ہے اس کے لیے لازمی ہے کہ اس کا عمل بھی اس کے موافق ہو، ورنہ وہ ان علمائے یہود کے نقشِ قدم کا پیرو ہے جن کو قرآن نے ملامت کی ہے کہ تم دوسروں کو تو خدا کے ساتھ وفاداری کی دعوت دیتے ہو، لیکن خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ جس آدمی یا جس گروہ کا رویّہ اس کی دعوت کے خلاف ہے وہ درحقیقت اپنی دعوت کی تردید کے دلائل خود پیش کرتا ہے۔ اور عمل کی دلیل چونکہ قول کی دلیل سے زیادہ قوی ہے اس وجہ سے خود اس کا رویّہ اس کے دعویٰ کے خلاف

ایسی حجّت ہے کہ اس کے بعد اس کی تردید کے لیے کسی اور حجّت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مسلمان اگر اللہ کے دین کے شاہد ہیں تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس پر ایمان بھی لائیں، اس کی دعوت بھی دیں اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں اس پر عمل بھی کریں۔ ورنہ اس شہادت کا حق ادا نہیں ہوسکتا جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو مامور کیا ہے۔ زندگی کے عملی معاملات میں اس دین سے منحرف رہنا اور زبان سے اس کے حق ہونے کی شہادت دینا خلق کے اوپر اتمامِ حجّت کے نقطۂ نظر سے ایک بالکل ہی لغو حرکت ہے۔ ایسے بے عمل واعظوں کے وعظوں کی بنا پر اللہ تعالیٰ اگر اپنی مخلوق کو مجرم ٹھہرائے تو یہ بات اس کے عدل کے خلاف ہوگی۔ البتہ اس کا یہ نتیجہ ضرور نکلے گا کہ خود مسلمانوں پر اس دین کی حجّت پوری طرح تمام ہو جائے گی اور قیامت کے دن وہ اپنے ہی اقراروں پر پکڑے جائیں گے۔ عملی معاملات میں دین سے انحراف کی جو شکلیں قابلِ درگذر ہیں ان کو قرآن نے خود بیان کر دیا ہے اور ساتھ ہی ان کا علاج بھی بتا دیا۔ اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ جذبات یا شہوات کے غلبہ سے آدمی کا کوئی قدم حق کے خلاف اٹھ جائے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی فوراً توبہ کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی حق سے انحراف پر مجبور کر دیا جائے۔ اس کی تلافی کی تدبیر یہ ہے کہ آدمی اس چیز سے نکلنے کے لیے جدّ وجہد کرے۔ اگر توبہ اور اصلاح کی جدّ وجہد کے بجائے آدمی اپنی غلطی ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا لے اور جس حالتِ اضطرار میں گرفتار ہو گیا ہے اسی کو دین و مذہب قرار دے بیٹھے تو شہادت علی النّاس کے جس منصب پر وہ مامور کیا گیا تھا، باطل پر اس کی اس قناعت نے، اس سے اسے خود بخود دہٹا دیا۔

چوتھی شرط

چوتھی شرط یہ ہے کہ یہ شہادت ہر قسم کی قومی و گروہی عصبیّت سے بالاتر ہو کر دی جائے، نہ کسی قوم کی دشمنی ہمیں اس حق سے منحرف کر سکے جس کے ہم داعی ہیں اور نہ کسی قوم کی حمایت وحمیّت کا جذبہ اس سے ہمیں منحرف کر سکے۔ اپنے مخالفوں کے مقابلہ میں ہمیں جس

طرح بے لاگ ہونا چاہیے، اس کی تعلیم قرآن نے ان الفاظ میں دی ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ (المائدہ ۵:۸)

"اے ایمان والو! عدل کے علم بردار بنو، اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے، اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم عدل نہ کرو۔"

اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کے مقابل میں جس طرح بے لوث ہونا چاہیے، اس کی تعلیم اس طرح دی ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ (النسآء ۴:۱۳۵)

"اے ایمان والو! حق پر جمے رہو، اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے، اگرچہ یہ شہادت خود تمھاری اپنی ذات، تمھارے والدین اور تمھارے قرابت مندوں کے خلاف ہی پڑے۔"

پانچویں شرط

پانچویں شرط یہ ہے کہ اس پورے حق کی شہادت دی جائے، جو خدا کی طرف سے اترا ہے، کسی ملامت یا مخالفت کے اندیشہ سے اس میں سے کوئی چیز کم نہ کی جائے۔ جن چیزوں کی شہادت انفرادی زندگی کے فرائض میں ہے ان کی شہادت افراد اپنی انفرادی زندگیوں میں دیں۔ نماز ہر شخص پڑھے۔ روزہ ہر شخص رکھے۔ زکوٰۃ ہر صاحبِ مال دے۔ حج ہر صاحبِ استطاعت کرے۔ نیکی، دیانت داری، راست بازی اور پاک بازی کی زندگی ہر مسلمان اختیار کرے۔ البتہ جن چیزوں کی شہادت کے لیے اجتماعی زندگی شرط ہے اس کے لیے افراد کا فرض ہے کہ جماعتی زندگی پیدا کرنے کے لیے جدّ وجہد کریں اور جب وہ وجود میں آجائے تو اس کی شہادت دیں۔ مثلاً معاشرت و معیشت کا اجتماعی نظام اور ملک کا سیاسی

نظم و نسق افراد کے بس کی چیز نہیں ہے۔ اس کو اسلامی ڈھانچہ میں ڈھالنے کے لیے ایک جماعت کی قوت درکار ہے۔ اس وجہ سے اس سلسلہ میں سب سے مقدم ضرورت ایک صالح جماعت کے قیام کی ہے۔ اس جماعت کے قیام کے بعد اجتماعی زندگی کے ہر گوشہ میں بھی اس حق کی شہادت واجب ہو جائی گی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اترا ہے۔ ذیل میں ہم چند آیتیں نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ کس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے دین کی، بغیر کسی کمی بیشی کے، دعوت کی تاکید کی گئی ہے:

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ (المائدہ ۵:۶۷)

"اے رسول! تمہاری طرف جو چیز تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اس کو اچھی طرح پہنچا دو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ لوگوں سے تمہاری حفاظت کرے گا۔"

الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَ لَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ (الاحزاب ۳۳:۳۹)

"وہ اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔"

وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ (الاحزاب ۳۳:۴۸)

"اور کافروں اور منافقوں کی بات کا دھیان نہ کرو۔ اور ان کی ایذا رسانیوں کو نظر انداز کرو، اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔"

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَ اسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ (الشوریٰ ۴۲:۱۵)

"پس تم اسی دین کی دعوت دو اور اس پر جمے رہو، جیسا کہ تم کو حکم ہوا ہے، اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیو۔ اور اعلان کر دو کہ اللہ نے جو کتاب اتاری ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں۔"

چھٹی شرط

چھٹی شرط یہ ہے کہ جب ضرورت داعی ہو، اللہ کے دین کی شہادت، جان دے کر دی جائے۔ یہ شہادت کا سب سے اونچا مرتبہ ہے۔ اسی وجہ سے ان لوگوں کو، جنہوں نے اللہ کے دین کو برپا کرنے کے لیے جہاد کیا اور جس حق پر ایمان لائے تھے اس کے حق ہونے کی گواہی تلواروں کی چھاؤں میں بھی دی، ان کو شہید کہا گیا ہے اور غور کیجئے تو ان لوگوں کے سوا نہ اس لقب کا کوئی اور مستحق ہوسکتا ہے اور نہ اس لقب کے سوا کوئی اور لقب ان کے لیے موزوں ہوسکتا ہے۔ اس امت پر شہادت علی النّاس کی جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی ہے اس کو پورا کرنے والے ہزاروں لاکھوں ہوسکتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی محنت کا اللہ کے ہاں اجر بھی پائے گا، لیکن جنہوں نے اس راہ میں اپنا پورا سرمایۂ زندگی لگا دیا اور اپنے سر دے کر اس حق کی گواہی دی، درحقیقت وہی اس بات کے اہل ہیں کہ ان کو شہید کا لقب ملے کیونکہ ایک چیز کے حق ہونے کی اس سے بڑی شہادت کوئی اور نہیں ہوسکتی کہ آدمی اس کی حمایت و نصرت کی راہ میں اپنا سر کٹا دے۔ پس جو ہمت ور یہ بازی کھیل گیا اس نے وہ شہادت دے دی جس کے بعد شہادت کا کوئی اور درجہ باقی نہ رہا۔

مسلمانوں کا فرضِ منصبی

یہی فریضۂ رسالت ہے جس کی وجہ سے اس امت کو "خیرِ امت" کہا گیا ہے۔ اگر مسلمان اس فرضِ منصبی کو بھلا دیں تو یہ دنیا کی قوموں میں سے بس ایک قوم ہیں، نہ ان کے اندر کوئی خاص خوبی ہے، نہ کوئی خاص وجہ فضیلت اور نہ پھر اللہ تعالیٰ کو اس بات کی پروا ہے کہ وہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں یا ذلت کے ساتھ۔ بلکہ اس فرض کو

فراموش کر دینے کے بعد وہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک معتوب قوم بن جائیں گے جس طرح دنیا کی دوسری قومیں، جو خدا کی طرف سے کسی منصب پر سرفراز کی گئی تھیں، اپنا فرض انجام نہ دینے کی وجہ سے معتوب ہوگئیں۔ چنانچہ جس آیت میں مسلمانوں کے ''خیرِ امت'' ہونے کا ذکر ہے اسی میں ان کی ذمہ داری بھی واضح کر دی گئی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران ۳:۱۱۰)

''تم بہترین امت ہو، لوگوں کی رہنمائی کے لیے مبعوث کیے گئے ہو، معروف کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

اسی جماعتی فرض کو ادا کرنے کی باضابطہ صورت خود اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی یہ ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ (آل عمران ۳:۱۰۴)

''اور چاہیے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو نیکی کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

اس حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ ٹھیک نبوّت کے طریق پر خلافت کی بنیاد رکھی۔ یہ ادارہ نیکی کی دعوت، معروف کے حکم اور منکر سے روکنے کا ایک جماعتی ادارہ تھا جو مسلمانوں نے اس لیے قائم کیا کہ اس جماعتی فرض کو انجام دے سکیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت کو حق پر استوار رکھنے اور دنیا کو حق کی دعوت دینے کے لیے اس امت پر ڈالا گیا تھا۔ جب تک یہ ادارہ صحیح طریقہ پر قائم رہا اور اپنے فرائض مسلمانوں کے اندر بھی اور مسلمانوں سے باہر بھی انجام دیتا رہا ہر مسلمان اس فرض سے سبکدوش رہا جو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے عائد کیا گیا تھا۔ اس وقت تک تبلیغ کا فرض ایک فرضِ کفایہ تھا اور جماعت کا ادارہ اس کو انجام دے کر

جماعت کے تمام افراد کو اس فرض کی ذمہ داری سے عند اللہ بری کر دیتا تھا۔ لیکن جب یہ نظام درہم برہم ہو گیا تو جس طرح کسی ملک کا سیاسی نظام درہم برہم ہو جانے کے بعد اس کے باشندوں کے جان و مال کی ذمہ داری خود ان کے اوپر منتقل ہو جاتی ہے اور جب تک وہ از سرِ نو اپنے نظامِ سیاسی کو درست نہ کر لیں ان میں سے ہر شخص اپنی حفاظت کا بوجھ خود اٹھاتا ہے۔ اسی طرح نظامِ خلافت کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اب یہ فریضۂ شہادت علی النّاس اس امت کے تمام افراد پر منتقل ہو گیا ہے اور جب تک وہ اس کو انجام دینے کے لیے اس صالح اسلامی نظام کو قائم نہ کریں جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس وقت تک اس فریضہ کے ادا نہ ہونے کا گناہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے اور قیامت کے دن اس کی پرسش ہر شخص سے ہوگی۔

خلاصۂ بحث

اس پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے:

(ا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام دنیا میں قیامت تک کے لیے تبلیغ دین کی جو ذمہ داری ڈالی گئی تھی اس کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنمائی فرما کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تکمیل کا کام اپنی امت کے سپرد فرمایا تاکہ یہ امت ہر ملک، ہر قوم اور ہر زبان میں قیامت تک اس دین کی تبلیغ کرتی رہے۔

(ب) اس تبلیغ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ شرط مقرر ہے کہ یہ دل سے کی جائے، زبان سے کی جائے، عمل سے کی جائے۔ بلا تقسیم و تفریق، پورے دین کی کی جائے۔ بے خوف لومۃ لائم اور بے رو رعایت کی جائے۔ اور اگر ضرورت داعی ہو تو جان دے کر کی جائے۔

(ج) اس جماعتی فرض کی ادائیگی کا باضابطہ ادارہ خلافت تھا اور جب تک یہ ادارہ موجود تھا ہر مسلمان اس فرض کی ذمہ داریوں سے سبکدوش تھا۔

(۵) اس ادارہ کے منتشر ہو جانے کے بعد اس فرض کی ذمہ داری اُمت کے تمام افراد پر ان کے درجہ اور استعداد کے لحاظ سے تقسیم ہوگئی۔

(۶) اب اس فرض کی مسؤلیت اور ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لیے دو ہی راہیں مسلمانوں کے لیے باقی رہ گئی ہیں: یا تو اس ادارہ کو قائم کریں یا کم از کم اس کو قائم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائیں۔

(۷) اگر مسلمان ان میں سے کوئی بات نہ کریں تو وہ اس فرضِ رسالت کو ادا نہ کرنے کے مجرم ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے سپرد کیا گیا ہے اور صرف اپنی ہی غلط کاریوں کا وبال اپنے سر نہ لیں گے، بلکہ خلق کی گمراہی کا وبال بھی ان کے سر آئے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تبلیغ کے لیے اصل محرک درحقیقت اس فرضِ عظیم کا احساس ہے جو مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالا گیا ہے اور اس میں جو چیز بطور مطمعِ نظر اس وقت پیشِ نظر رکھنی ہے وہ یہ ہے کہ وہ نظامِ دعوت خیر پھر وجود میں آجائے جو خلق کو اللہ کے دین کی راہ بتا سکے اور دنیا پر اتمامِ حجّت کر سکے۔ جب تک یہ چیز دنیا میں موجود نہیں ہے ہر مسلمان کا سب سے مقدّم اور سب سے بڑا اور سب سے اعلیٰ مقصد یہی ہے کہ اس کو وجود میں لانے کے لیے جو کچھ کر سکتا ہے کرے۔ اسی کے لیے ہر مسلمان کو سونا اور جاگنا چاہیے، اسی کے لیے کھانا اور پینا چاہیے اور اسی کے لیے مرنا اور جینا چاہیے۔ اس کے بغیر مسلمانوں کی زندگی خدا کے منشا کے بالکل خلاف ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ اپنی اس کوتاہی کے لیے کوئی عذر نہ کر سکیں گے۔ یہ چیز ان کی ہستی کی غایت ہے۔ اگر اس کو انہوں نے کھو دیا تو جس طرح وہ تمام چیزیں جو اپنے مقصدِ وجود کو کھو کر کوڑے کرکٹ میں شامل ہو جاتی ہیں اسی طرح یہ بھی اس زمین کے خس و خاشاک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اور ان کے یہ ہرگز زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ''امتِ وسط'' یا ''خیرِ امت'' کے لقب کا مستحق سمجھیں یا اللہ تعالیٰ سے کسی نصرت و حمایت کی امید رکھیں۔

باب ۳

انبیائے کرام
پہلے کن کو مخاطب کرتے ہیں

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام اپنے مقصد کی تبلیغ کے لیے پہلے کن لوگوں کو مخاطب کرتے ہیں اور کس طرح مخاطب کرتے ہیں؟

سوال کے پہلے جزو کا مطلب یہ ہے کہ یوں تو انبیاء کی بعثت ان کی پوری قوم کی طرف ہوتی ہے، لیکن کیا وہ آغازِ کار ہی میں پوری قوم کو مخاطب کرتے ہیں یا شروع شروع میں ان کا تخاطب قوم کے کسی خاص طبقہ سے ہی ہوتا ہے؟ اگر کسی خاص طبقہ ہی سے ہوتا ہے تو وہ کونسا طبقہ ہے، عامۃ النّاس کا یا ان لوگوں کا جو عامۃ النّاس کی قیادت و رہنمائی کر رہے ہوتے ہیں؟

سوال کے دوسرے جزو کا منشا یہ ہے کہ یہ ایک واقعہ ہے کہ ہر نبی کی قوم، شروع شروع میں، اس کی دعوت سے بیگانہ، بلکہ اس کی شدید مخالف رہی ہے پھر کیا انہوں نے سب کو منکر و کافر فرض کر کے اپنی دعوت کا آغاز "اے کافرو! ایمان لاؤ"۔ "اے مشرکو! اللہ کو ایک مانو" سے کیا یا ان کا طرزِ خطاب کچھ اور رہا؟ یہ دونوں سوال نہایت اہم ہیں۔ ان کو ٹھیک نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں نے دعوت کے نقطۂ آغاز کو متعیّن کرنے میں بھی غلطیاں کی ہیں اور بہتیرے اپنا اور اپنے مخاطبوں کی صحیح پوزیشن سمجھنے میں بھی افراط و تفریط میں مبتلا ہوئے ہیں۔ جس کا نتیجہ یا تو یہ ہوا کہ ساری دعوت ایک غلط نقطہ سے شروع ہونے کی وجہ سے بے اثر رہ

گئی یا داعی اور مدعو کا صحیح موقف معین نہ ہونے کی وجہ سے اس نے ایک فتنہ کی شکل اختیار کر لی اور اصلاح کے بجائے اس سے بڑے بڑے فسادات اٹھ کھڑے ہوئے۔

انبیاء کا خطاب وقت کے لیڈروں سے

اس باب میں ہم سوال کے پہلے حصہ کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔ اس تاریخ کی روشنی میں جو قرآن نے پیش کی ہے، ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام سب سے پہلے قوم کے اربابِ اثر کو مخاطب کرتے ہیں اور ان کی اصلاح کو عوام کی اصلاح کا ذریعہ بناتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے خود اپنے اس خاندان کو دعوت دی جو قوم کی مذہبی پیشوائی کی مسند پر متمکن تھا۔ پھر اس بادشاہ کو دعوت دی جس کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار کی باگ تھی اور جو اپنے آپ کو لوگوں کی زندگی اور موت کا مالک سمجھے ہوئے بیٹھا تھا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ

(البقرۃ ۲:۲۵۸)

”کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے، اس کے رب کے باب میں، اس وجہ سے حجت کی کہ خدا نے اس کو اقتدار بخشا تھا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ سب سے پہلے فرعون کو مخاطب کریں:

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿١٧﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ﴿١٨﴾ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿١٩﴾ (النزعت ۷۹:۱۷-۱۹)

”تم فرعون کے پاس جاؤ، اس نے بہت سر اٹھایا ہے۔ اس سے کہو کہ کیا تم میں کچھ اپنے کو سدھارنے کا جذبہ ہے؟ کیا میں تمہیں تمہارے رب کی راہ دکھاؤں کہ تم اس سے ڈرنے والے بنو؟“

دور سے آتے ہیں اور داخلِ اسلام ہوتے چلے جاتے ہیں، لیکن قریش کے لیڈر، ابولہب، ابوجہل، امیہ بن خلف وغیرہ اور طائف کے اشراف، جن کے سامنے خدا کا رسول شب و روز دعوتِ حق بلند کرتا ہے، اس برکت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان میں سے اگر فیض پاتے بھی ہیں تو وہ غریب عوام جن کی طرف ابھی دعوت کا خطاب براہِ راست نہیں، بلکہ بالواسطہ ہے۔ جو لوگ ترتیبِ دعوت میں پیچھے ہیں وہ قبولِ دعوت میں آگے ہو جاتے ہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام کی یہ بات پوری ہو کے رہتی ہے کہ "کتنے ہیں جو آگے ہیں، وہ پیچھے رہ جائیں گے اور کتنے ہیں جو پیچھے ہیں وہ آگے ہو جائیں گے"۔ لیکن اس واقعہ کے باوجود حضرات انبیائے کرام علیہم السلام اپنی دعوت کی ترتیب نہیں بدلتے اور عامۃ النّاس کو اس وقت تک براہِ راست مخاطب نہیں کرتے جب تک وقت کے کارفرما عناصر اور لیڈر حضرات اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے ان کو مایوس نہ کریں۔ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی بعثت کے بعد برابر علمائے یہود کے جمود پر ضربیں لگاتے رہے، لیکن ایک عرصہ کی جدّ و جہد کے بعد بھی جب ان کے کبر و غرور اور پندارِ سیاست کی چٹان نہ ٹوٹی تو وہ ان کو چھوڑ کر جھیل کے کنارے ماہی گیروں کے پاس چلے گئے اور ان کو دعوت دی کہ "اے مچھلیوں کے پکڑنے والو! آؤ، میں تمہیں آدمی کا پکڑنے والا بنا دوں" اور اللہ تعالیٰ نے انہی کے اندر سے ان کو ایسے اہلِ ایمان دیے جو انؑ کے حواری کہلائے:

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾

(آل عمران ۳: ۵۲)

"پس جب عیسیٰؑ نے ان کی طرف سے کفر کو بھانپ لیا تو اس نے دعوت دی کہ کون میرا مددگار بنتا ہے، اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار، اور آپ گواہ رہیے کہ ہم مسلم ہیں۔"

اس آیت میں ان کی اس دعوتِ عام کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے اس وقت بلند

حضرت دانیال علیہ السلام نے اپنے وقت کے شہنشاہِ اعظم، بنوخذنصر کو دعوت دی۔ یرمیاہ نبی نے شمال کے بادشاہوں پر نبوّت کی۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے سب سے پہلے علمائے یہود کو دعوت دی۔ اسی طرح حضرات نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام، شعیب علیہ السلام، سب کی دعوتیں قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ ان میں سے ہر نبی نے سب سے پہلے اپنے وقت کے اربابِ اقتدار اور متکبّرین کو جھنجھوڑا اور ان کے افکار ونظریات پر ضرب لگائی۔ سب سے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپ کو حکم ہوا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔ یہ لوگ عرب کی مذہبی اور پدرسرانہ (PATRIARCHICAL) حکومت کے اربابِ حل وعقد تھے اور اس کے واسطہ سے سارے عرب کی اخلاقی اور سیاسی رہنمائی کر رہے تھے۔ عرب کے علاوہ بقیہ دنیا کو دعوت دینے کے لیے بھی آپ نے ''امّتِ وسط'' کو جو طریقہ بتایا وہ یہ تھا کہ آپ نے متعدد سلاطینِ عالم کو نامے لکھے اور اسلام کو پہلے ان کے سامنے پیش کیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ ''اسلام لاؤ، سلامت رہو گے، ورنہ تمہاری اور تمہارے زیردستوں، دونوں کی گمراہی کی ذمہ داری تم پر آئے گی''۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ بعد میں امت کے اربابِ حل وعقد دعوتِ عام کے لیے، اسی طریقہ کی پیروی کریں اور خلافتِ راشدہ کی پوری تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس طریقہ پر تبلیغِ عام کی وہ ذمہ داری ادا کی جو ان پر شہداء علی النّاس کی حیثیت سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ڈالی گئی تھی۔

حضرت مسیح علیہ السلام کا خطاب

یہ ایک حقیقت ہے جس سے کوئی شخص، جس نے انبیاء کی تاریخ پڑھی ہو، انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ساتھ ہی اس واقعہ سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جن کے بام و در پر آفتابِ ہدایت کی کرنیں سب سے پہلے پھیلتی ہیں تقدیر کی نیرنگی سے قبول ہدایت میں سب سے پیچھے وہی رہتے ہیں۔ حبش کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ، فارس کے سلمانؓ اور مدینہ کے کسان دور

کی ہے جب وہ وقت کے علماء اور لیڈروں کے قبولِ حق کی طرف سے مایوس ہو گئے ہیں۔ اس وقت انھوں نے اپنی دعوت غرباء اور عوام کے سامنے پیش کی اور ایسے درد کے ساتھ پیش کی کہ جس دعوت سے یروشلم کے پشتینی دیندار ذرا نہ پسیجے اس نے دریا کے کنارے کے ملاحوں کے دلوں کو موم کر دیا اور بالآخر انھی کے اندر سے دعوتِ حق کے وہ خادم پیدا ہوئے جنھوں نے بڑی بڑی زہرہ گداز آزمائشوں کا مقابلہ کر کے اس کو دنیا میں غالب اور فتح مند کیا۔ سورۂ صف میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنصَارَ اللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ ۖ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ ۖ فَآمَنَت طَّائِفَةٌ مِّن بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَفَرَت طَّائِفَةٌ ۖ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ ﴿١٤﴾ (الصف ٦١:١٤)

"اے ایمان والو! تم اللہ کے انصار بنو، جیسا کہ عیسیٰ ابنِ مریم نے دعوت دی حواریوں کو: کون میرا مددگار بنتا ہے اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم اللہ کے انصار بنتے ہیں۔ تو بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے کفر کیا۔ تو ہم نے ایمان والوں کی، ان کے دشمنوں کے مقابل میں، مدد کی تو وہ غالب رہے۔"

حضرت مسیح علیہ السلام نے ہدایت و ضلالت کے باب میں تقدیر کی اس نیرنگی پر کہ آگے بڑھنے والے پیچھے رہ جائیں اور پیچھے والے آگے نکل جائیں، نہایت مؤثر اور بصیرت افروز تمثیلیں بھی کہی ہیں۔ لیکن بحث بالکل دوسرے گوشہ میں نکل جائے گی، اس وجہ سے ہم ان کو نظرانداز کرتے ہیں۔ یہاں صرف اس حقیقت کو ہم سامنے لانا چاہتے ہیں کہ اگرچہ قبولِ دعوت میں عموماً سبقت عام لوگ ہی کرتے ہیں جو ترتیبِ دعوت میں مؤثر ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود حضرات انبیائے کرام علیہم السلام جب تک وقت کے ذہین اور کارفرما عناصر سے مایوس نہیں ہو جاتے اس وقت تک عامۃ النّاس کو براہِ راست مخاطب نہیں کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب

غور کر کے دیکھیے تو بعینہٖ یہی صورتِ حال آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں بھی نظر آئے گی۔ آپ نے پہلے، اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق، قریش کو دعوت دی جو سارے عرب کے مذہبی و سیاسی پیشوا تھے، اور ان کے سرداروں میں سے ایک ایک کے سامنے اللہ کے دین کو پیش کیا۔ جب ان کی طرف سے نفرت اور مخالفت کا مظاہرہ ہوا تو آپ نے ان کے قبولِ اسلام کے لیے دعائیں بھی کیں۔ ان میں سے بعض بعض کے لیے، جو قوم میں خاص اہمیّت رکھتے تھے، آپ نے تعیّن کے ساتھ نام لے کر بھی دعا فرمائی۔ مثلاً منقول ہے کہ آپ نے دعا فرمائی کہ "اے اللہ! عمر یا ابوجہل کے اسلام سے اسلام کی دعوت کو قوت دے"۔ ان لوگوں کے قبولِ اسلام کا شوق آپ پر اس قدر غالب تھا کہ اس جوش میں نہ آپ کو اپنے ضروری آرام کا خیال رہتا نہ اپنے مرتبہ اور عظمت کا، بلکہ بسا اوقات یہ انہماک آپ پر اس قدر غالب ہو جاتا کہ ان مسلمانوں کی تربیت کے لیے بھی آپ کے پاس وقت نہ بچتا جو نعمتِ اسلام سے بہرہ ور ہو چکے ہوتے اور تربیت کے محتاج ہوتے۔ لیکن ان کی ساری باتوں کے باوجود آپ ایک مدت تک انہی لوگوں کے ساتھ مشغول رہے اور ان کے ہر قسم کے طعن وطنز، تحقیر واستہزاء اور عناد واختلاف کو برداشت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب اتمامِ حجّت کا حق ادا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان لوگوں کے پیچھے وقت ضائع کرنے سے روک دیا اور صرف ان لوگوں کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیا جو یا تو ایمان لا چکے تھے یا جن سے توقع تھی کہ اگر ان کو کوئی نصیحت کی جائے گی تو چونکہ وہ لیڈری کے مخصوص امراض سے پاک ہیں اس وجہ سے سنیں گے اور مانیں گے۔ یہی مقام ہے جہاں پہنچ کر آپ کو متکبّرین سے اعراض کا حکم دیا گیا ہے:

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ﴿٥٤﴾ وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥٥﴾ (الذریت ۵۱: ۵۴-۵۵)

''پس ان سے تم اعراض کرو، اب تم پر کوئی الزام نہیں۔ اور یاد دہانی کرتے رہو۔ کیونکہ یاد دہانی ایمان والوں کو نفع پہنچاتی ہے۔''

عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی ۝۱ اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی ۝۲ وَ مَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰۤی ۝۳ اَوۡ یَذَّکَّرُ فَتَنۡفَعَہُ الذِّکۡرٰی ۝۴ اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰی ۝۵ فَاَنۡتَ لَہٗ تَصَدّٰی ۝۶ وَ مَا عَلَیۡکَ اَلَّا یَزَّکّٰی ۝۷ وَ اَمَّا مَنۡ جَآءَکَ یَسۡعٰی ۝۸ وَ ہُوَ یَخۡشٰی ۝۹ فَاَنۡتَ عَنۡہُ تَلَہّٰی ۝۱۰ کَلَّاۤ اِنَّہَا تَذۡکِرَۃٌ ۝۱۱ فَمَنۡ شَآءَ ذَکَرَہٗ ۝۱۲ فِیۡ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ ۝۱۳ مَّرۡفُوۡعَۃٍ مُّطَہَّرَۃٍۭ ۝۱۴ بِاَیۡدِیۡ سَفَرَۃٍ ۝۱۵ کِرَامٍۭ بَرَرَۃٍ ۝۱۶ (عبس ۸۰: ۱-۱۶)

''اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ آیا اس کے پاس نابینا اور تمھیں کیا معلوم شاید وہ اپنی اصلاح کرتا یا نصیحت سنتا تو نصیحت اس کو نفع پہنچاتی، جو بے پروائی برتتا ہے اس کے تو تم پیچھے پڑتے ہو حالانکہ تم پر کوئی ذمہ داری نہیں اگر وہ اپنی اصلاح نہ کرے اور جو تمہارے پاس شوق سے آتا ہے اور وہ خدا سے ڈرتا بھی ہے تو تم اس سے بے پروائی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک یاد دہانی ہے تو جو چاہے یاد دہانی حاصل کرے۔ لائقِ تعظیم، بلند اور پاکیزہ صحیفوں میں، معزز باوقار کاتبوں کے ہاتھوں میں۔''

لَا تَمُدَّنَّ عَیۡنَیۡکَ اِلٰی مَا مَتَّعۡنَا بِہٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡہُمۡ وَ لَا تَحۡزَنۡ عَلَیۡہِمۡ وَ اخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۝۸۸ (الحجر ۱۵: ۸۸)

''ہم نے ان کے مختلف گروہوں کو جن چیزوں سے بہرہ مند کر رکھا ہے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو اور نہ ان کی حالت پر غم کرو اور اپنی شفقت کے بازو اہلِ ایمان پر جھکائے رکھو۔''

اس طرزِ خطاب کے وجوہ

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا اپنی دعوت میں یہ ترتیب اختیار کرنا محض ایک اتفاقی واقعہ نہیں ہے، بلکہ اس کے کچھ خاص اسباب ہیں، جن میں سے بعض کی طرف ہم

یہاں اشارہ کریں گے۔

پہلی وجہ

اس کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ واضح وجہ تو یہ ہے کہ عوام النّاس علم وعمل اور اخلاق وکردار میں ان لوگوں کے تابع ہوا کرتے ہیں جو سوسائٹی میں اثر و اقتدار رکھتے ہوتے ہیں۔ مشہور ہے کہ "اَلنَّاسُ عَلیٰ دِین ملوکھم" لوگ ارباب اقتدار کے دین پر چلتے ہیں۔ اس وجہ سے اگر ارباب اقتدار اصلاح قبول کرلیں تو عوام النّاس خود بخود ٹھیک ہو جاتے ہیں اور اگر یہ بگڑے رہیں تو عوام النّاس تو کوئی اصلاح قبول نہیں کرتے اور اگر قبول کر بھی لیتے ہیں تو اس کا اثر بہت جلد اڑ جایا کرتا ہے۔

دوسری وجہ

دوسری وجہ یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام امتیاز رکھنے والے طبقات (PRIVILEGED CLASSES) کے خلاف نہ تو کسی سیاسی یا معاشی تعصب میں مبتلا ہوتے ہیں اور نہ گرے ہوئے طبقات کے لیے ان کے دلوں میں کوئی بے جا عصبیت ہوتی ہے کہ وہ طبقاتی جنگ برپا کر کے مقدّم الذکر کو پست اور مؤخر الذکر کو بلند کرنے کی کوشش کریں۔ وہ جو مشن دنیا میں لے کر آتے ہیں وہ کسی فساد کو دوسرے فساد سے بدل دینے سے پورا نہیں ہوسکتا، بلکہ پوری سوسائٹی کو خدا پرستی، صلۂ رحمی اور خوفِ آخرت کی اساس پر قائم کرنے سے پورا ہوتا ہے اس وجہ سے عوام ہوں یا خوص، وہ دونوں کو یکساں محبت و ہمدردی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور دونوں کے لیے یکساں طور پر اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنی اپنی بیماریوں سے پاک ہوکر، صحت قبول کرلیں۔ البتہ اصلاح کی اس جدّ وجہد میں وہ اونچے طبقات کی اصلاح کو مقدّم رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت انہی کی بیماریاں ہوتی ہیں جن کی چھوت سے دوسرے بیمار ہوئے ہوتے ہیں۔ پس ان کے علاج

کی فکر وہ پہلے کرتے ہیں تاکہ ان کے تندرست ہو جانے کے بعد دوسروں کے علاج میں کچھ زیادہ زحمت باقی نہ رہے۔ اس کے بالکل برعکس ان لوگوں کا طریقہ ہے جو اونچے طبقات کے خلاف ایک قسم کا معاشی تعصب یا انتقام کا جذبہ رکھتے ہیں۔ یہ لوگ عوام کو سرمایہ داروں کے خلاف بھڑکا کر طبقاتی جنگ برپا کرتے ہیں۔ جس کے نتیجہ کے طور پر ان کے خیال میں، وہ عوامی ڈکٹیٹرشپ وجود میں آجاتی ہے جو ان کے نزدیک تمام خیر و فلاح کا سرچشمہ ہے۔ حالانکہ اس تمام خون خرابہ کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ پرانے سرمایہ داروں کی ڈکٹیٹرشپ ختم ہوتی ہے اور نئے سرمایہ داروں کی ڈکٹیٹرشپ اس کی جگہ لے لیتی ہے اور ظلم و ناانصافی کا اجارہ جو اب تک چند پرانے خاندانوں کو حاصل تھا وہ چند نئے خاندانوں کو حاصل ہو جاتا ہے۔ اس انقلاب سے دنیا کو اگر کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ایک گروہ کی آتشِ انتقام بجھ جاتی ہے اور ظلم و ناانصافی اور جاہ و اقتدار کی جو خواہشیں وہ اب تک دبائے ہوئے بیٹھا تھا اور جن کو ابھرنے کا کوئی موقعہ نہیں مل رہا تھا، ان کے ابھرنے اور کھل کھیلنے کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ جن کا منتہائے نظر صرف اس قسم کی اصلاح ہو وہ تو بلاشبہ اس عوام بازی سے اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں، لیکن انبیاء جس انقلاب کو برپا کرنے کے لیے آتے ہیں وہ صرف اتنے سے پورا نہیں ہو سکتا کہ زار کو لینن اور سٹالن سے بدل دیا جائے۔ بلکہ وہ بڑے اور چھوٹے ہر ایک کے اندر سے ظلم و ناانصافی کے محرکات ختم کر دینے سے پورا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس قسم کی ہلّو بازی ان کے مقصد کے بالکل خلاف ہے۔

تیسری وجہ

تیسری وجہ یہ ہے کہ جو طبقہ قوم میں اونچا ہے عموماً ذہنی اعتبار سے وہی برتر ہوتا ہے۔ یہ ذہنی برتری ہی درحقیقت اس کو قیادت کی جگہ دلاتی ہے اس وجہ سے کوئی دعوت جس کا مقصد ایک اہم فکری و عملی انقلاب ہو، ان کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ یہ لوگ اگر کسی صحیح فکر کو قبول کر لیں تو اس کی اساس پر کسی بڑے سے بڑے نظام کو چلا سکتے ہیں۔ اس پہلو سے یہ ایک بڑی

قیمت رکھتے ہیں اوران کوضائع کرنے میں اصلی نقصان خودان کونہیں پہنچتا، بلکہ اس سوسائٹی کو پہنچتا ہے جس کے اندر سے اس طبقہ کوختم کردیا جاتا ہے۔ اگرعوامی انقلاب برپا کر کے یہ ختم کردیے جائیں تو پوری سوسائٹی بالکل اس دودھ کی مانندرہ جاتی ہے جس کا مکھن نکال لیا گیا ہو۔ ایسی سوسائٹی جب انقلاب کی رست خیز سے فارغ ہوکرزندگی کی نئی تعمیر کے نقشے بناتی ہے تب اس کو اپنے دیوالیہ پن کا احساس ہوتا ہے۔ اس وقت اسے علانیہ نظرآتا ہے کہ آگے کے کاموں کے لیے جوذہنی وفکری صلاحیتیں درکار ہیں ان صلاحیتوں سے اس کی فوج بالکل خالی ہوچکی ہے۔ روس کے پہلے انقلاب کے بعد بالکل یہی صورت پیش آئی تھی۔ انقلاب کے خاتمہ پر جن لوگوں کے ہاتھوں میں طاقت آئی وہ بالکل نہیں جانتے تھے کہ اپنے نظریات پر حکومت کا انتظام کس طرح چلائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آگ اور خون کی ہولی کھیل کر جواقتدار انھوں نے حاصل کیا وہ اقتدار خود سنبھال نہ سکے بلکہ سنبھالنے کے لیے اس کو انہی لوگوں کے حوالہ کرنا پڑا جن سے وہ چھینا گیا تھا۔ یہ گروہ ہنگامۂ عام سے مرعوب ہوکر ان نئے نظریات کے آگے جھک تو ضرور گیا تھا، لیکن اپنے دل کے اندر ان کے خلاف سخت نفرت وعداوت چھپائے ہوئے تھا۔ اس وجہ سے اس اقتدار کو اس نے بالکل منافقانہ طور پر استعمال کیا اور اس کے ہاتھوں اس پہلے اشتراکی انقلاب کا حشر وہی ہوا جو کسی تحریک کا اس کو منافقانہ طور پر اختیار کرنے والوں کے ہاتھوں ہوسکتا ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کا طریقۂ دعوت اس قسم کی غلطیوں سے بالکل پاک ہے۔ وہ اپنی دعوت سب سے پہلے ذہین طبقہ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس طبقہ میں سے جو لوگ ذہانت کے ساتھ سیرت کی بلندی بھی رکھتی ہیں وہ جب اس دعوت کو قبول کرلیتے ہیں تو ان کی تائید سے دعوت کی قوت دوچند ہوجاتی ہے۔ "خیارھم فی الجاھلیّة خیارھم فی الاسلام اذا افقھوا"[1] (جو ان کے اندر جاہلیّت میں بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ثابت ہوں گے بشرطیکہ وہ حق کو سمجھ جائیں) میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ اسی طریقِ دعوت کی برکت تھی کہ

---

[1] صحیح البخاری: کتاب الانبیاء باب ۵۴۔

اسلام کو حضرات ابوبکر صدّیقؓ اور عمرِ فاروقؓ جیسے لوگ مل گئے۔ جنہوں نے ایک طرف تو اپنی ذہانت کی وجہ سے اصل دعوت کی فکری روح کو اس طرح اپنے اندر جذب کرلیا کہ وہ بذاتِ خود اصل دعوت کے شارح ومفسرّ بن گئے اور دوسری طرف اپنے کردار کی بلندی کی وجہ سے اپنے اندر وہ ایسی ہمتِ مردانہ رکھتے تھے کہ اس دعوت کی اساس پر انہوں نے ایک پورا نظامِ اجتماعی مرتّب کر کے اس کو چلا دیا اور دنیا کو دکھا دیا کہ اسلام عملی حیثیت سے یہ کچھ چاہتا ہے۔

چوتھی وجہ

چوتھی وجہ یہ ہے کہ یہ طبقہ مادی اعتبار سے بھی برتر ہوتا ہے۔ یہ مادی برتری فی نفسہٖ کوئی بری چیز نہیں ہے کہ اس سے لازماً نفرت ہی کی جائے۔ اس کے اندر برائی کا اگر پہلو ہے تو صرف اس صورت میں ہے جب یہ باطل کی تائید وتقویّت کا ذریعہ ہو۔ اگر باطل کے بجائے یہ حق کی تائید وتقویّت کا ذریعہ بن جائے تو جس طرح سلیمانؑ کی شوکت اور ذوالقرنین کی سلطنت ایک نعمت وبرکت تھی اسی طرح ہر مادی برتری اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے اربابِ جاہ کو حق کی دعوت پہنچانے میں جو اس قدر انہماک تھا اس میں جہاں اور پہلو مدِّ نظر تھے وہاں خاص طور پر یہ چیز بھی پیشِ نظر تھی کہ اگر یہ لوگ دعوت قبول کرلیں گے تو جن مادی اسباب ووسائل پر یہ قابض ہیں وہ آپ سے آپ حق کی نصرت واعانت کے لیے وقف ہو جائیں گے۔ اس سے ایک طرف تو یہ ہوگا کہ باطل کے ہاتھوں میں سے ایک بہت بڑی طاقت چھن جائے گی اور دوسری طرف یہ ہوگا کہ یہی طاقت باطل کے خلاف لڑنے کے لیے حق کے ہاتھوں میں ایک زبردست تلوار بن جائے گی۔ ہر دعوتِ حق کا آغاز بے سروسامانی ہی کی حالت میں ہوتا ہے اور وہ اسی طرح آہستہ آہستہ وقت کے مادی وسائل وذرائع کو فتح اور ایجاد واختراع کی قابلیتوں اور علوم وفنون کی طاقتوں کو مسخر کرتی ہے اور جب وقت آتا ہے، ان کو باطل کے حلاف صف آرا

کر دیتی ہے۔ اس بات کو جس طرح دنیا کی ہر تحریک کا لیڈر چاہتا ہے اسی طرح حضرات انبیائے کرام علیہم السلام بھی اس کو چاہتے ہیں، لیکن دوسروں میں اور انبیائے کرام میں یہ فرق ہے کہ ان کے یہاں یہ چیز اتنی اہمیت کبھی نہیں حاصل کرتی کہ اس کے آگے خود اصل مقصد غیر اہم ہو کے رہ جائے۔ اس وجہ سے جس منزل میں یہ خواہش اپنی اصل حد سے متجاوز ہونے لگتی ہے وہاں اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو روک دیتا ہے کہ تم کفار کے مال و جاہ کی طرف نظر نہ اٹھاؤ تمہاری دعوت اپنا زاد و راحلہ اور اپنی حفاظت و ترقی کے سروسامان خود اپنے ساتھ رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارا اور تمہاری دعوت کا خود کفیل ہے:

وَ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَ رِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ أَبْقَىٰ ﴿١٣١﴾ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَوٰةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۖ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُكَ ۗ وَ الْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ ﴿١٣٢﴾ (طٰہٰ ۲۰: ۱۳۱-۱۳۲)

"اور ان کی بعض جماعتوں کو آسائشِ زندگی کی جس رونق سے ہم نے، ان کی آزمائش کے لیے، بہرہ مند کر رکھا ہے اس کی طرف نگاہ نہ اٹھاؤ اور تمہارے رب کا رزق بہتر اور پائدار ہے اور اپنے لوگوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر جمے رہو۔ ہم تم سے رزق کا مطالبہ نہیں کرتے۔ ہم تم کو رزق دیں گے اور انجامِ کار فیروزمندی تقویٰ کے لیے ہے۔"

پانچویں وجہ

پانچویں وجہ یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام دنیا میں ایک ایسے نظامِ حق کو برپا کرنے کے لیے آتے ہیں جس کی بنیاد خدا کی بندگی، ایماندارانہ تنقید، بے رو رعایت احتساب، اجتہاد اور شوریٰ پر مبنی ہو نہ کہ شخصیت پرستی پر۔ اس وجہ سے قدرتی طور پر وہ سب سے پہلے ان لوگوں کو تلاش کرتے ہیں جن کی طبیعت میں کم از کم اتنی بلندی ہو کہ وہ اشخاص کے پیچھے چلنے کے بجائے اپنی فکر و رائے کے پیچھے چل سکیں۔ جن لوگوں

کے اندر یہ جوہر نہ ہو وہ اس مقصد کے لیے بے کار ہیں جس کو لے کر حضرات انبیائے کرام علیہم السلام آتے ہیں۔ یہ جوہر رکھنے والے اشخاص یوں تو ہر طبقہ کے اندر ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں، لیکن جواہرات کی تلاش بہر حال پہلے معدن ہی میں کی جاتی ہے نہ کہ گھورے پر۔ اس وجہ سے اپنے مقصد کے آدمی چھانٹنے کے لیے حضرات انبیائے کرام علیہم السلام پہلے سوسائٹی کے ذہین طبقہ ہی کو مخاطب کرتے ہیں اور جب تک ان کی طرف سے مایوس نہیں ہو جاتے دوسری طرف نگاہ نہیں اٹھاتے۔ اس کے برعکس جو لوگ اصول و مقاصد کے بجائے اپنی شخصیتوں کی پرستش کرانا چاہتے ہیں وہ ہمیشہ ذہین طبقہ سے کترا کر عوام میں اپنی تحریک چلاتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ اگر کچھ سیاسی قابلیت و ہمت رکھتے ہیں تو اپنی ڈکٹیٹرشپ قائم کر لیتے ہیں۔ اور اگر سیاسی قابلیت نہیں رکھتے یا قابلیت تو رکھتے ہیں لیکن اس کے لیے پوری ہمت نہیں رکھتے تو بس ایک عوامی لیڈر بن کے رہ جاتے ہیں۔ اور اگر کچھ مذہبی سوانگ رچانا جانتے ہیں تو پیری مریدی کی ایک گدی قائم کر لیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ ذہین طبقہ سے اسی طرح گھبراتے ہیں جس طرح چور دن کی روشنی سے گھبراتا ہے۔ ان کے سارے کھیل اندھیرے ہی میں کھیلے جا سکتے ہیں اس وجہ سے یہ اندھیرے ہی کو پسند کرتے ہیں۔

چھٹی وجہ

چھٹی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی سوسائٹی کے ذہین طبقہ کو چھوڑ کر اس کے عوام سے کوئی تحریک شروع کی جائے تو عوام میں سے جو لوگ اس تحریک کو قبول کرتے ہیں وہ شبہوں اور اندیشوں میں، بلکہ ایک قسم کے احساسِ کمتری کے مرض میں مبتلا رہتے ہیں اور جب تک سوسائٹی کے اونچے طبقہ کے کچھ لوگ اس تحریک کے ہم نوا نہ بن جائیں اس وقت تک ان کے اندر اس کے لیے وہ شرحِ صدر نہیں پیدا ہوتا کہ وہ اس کے اثر سے سرشار ہو کر اس کے لیے کوئی بازی کھیل سکیں۔ اس کی نفسیاتی وجہ بالکل کھلی ہوئی یہ ہے کہ وہ اگرچہ خود اس تحریک

کے معتقد ہو چکے ہوتے ہیں، لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ابھی ان لوگوں کو اس تحریک نے مفتوح نہیں کیا ہے جن کی ذہنی و مادی برتری وہ اب تک تسلیم کرتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ کبھی تو وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ قبول نہ کرنے والوں ہی کا قصور ہو سکتا ہے اور کبھی یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ ممکن ہے کہ تحریک کے فلسفہ ہی میں کوئی ضعف ہو جو اُن کو نظر آ رہا ہو اور اِن کو نظر نہ آ رہا ہو۔ یہ تذبذب کی بیماری ان کو تحریک کے لیے بالکل بے کار بنا کر چھوڑ دیتی ہے اور وہ اقرار کر کے بھی گویا انکار کرنے والوں ہی کی صف میں رہتے ہیں۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا طریقہ اس خامی سے بالکل پاک ہے۔ وہ شروع ہی میں ان لوگوں کے افکار و نظریات پر حملہ کرتے ہیں جن کی قیادت میں سوسائٹی کا نظام چل رہا ہوتا ہے۔ اور کچھ دنوں کی کشمکش کے بعد وہ ایک طرف تو وقت کے اخلاقی، سیاسی اور مابعد الطبیعی فلسفہ کی جڑیں اکھاڑ کے رکھ دیتے ہیں اور دوسری طرف ان لوگوں کو زچ کر دیتے ہیں جو اس غلط فلسفہ پر نظامِ اجتماعی و سیاسی کو چلا رہے ہوتے ہیں۔ اس دوران میں عوام النّاس تقریباً غیر جانبدار رہ کر اس ساری کشمکش کا نہایت غور سے مطالعہ کرتے ہیں اور اندازہ کرتے ہیں کہ اس معرکہ میں حق کس کی جانب ہے۔ بعض پر، جو ذہین ہوتے ہیں، پہلے مرحلے میں واضح ہو جاتا ہے کہ حق پیغمبر کے ساتھ ہے اور وہ اس کو قبول بھی کر لیتے ہیں۔ باقی جو زیادہ ذہین نہیں ہوتے، کچھ عرصہ تذبذب میں مبتلا رہتے ہیں۔ لیکن جب یہ کشمکش اس مرحلہ میں پہنچتی ہے جس مرحلہ میں باطل اپنی حمایت اور حق کے ابطال کے لیے اوچھے ہتھیاروں کے استعمال پر اتر آتا ہے تو ان کے سامنے بھی حق بالکل واضح ہو کر آ جاتا ہے اور وہ بھی اس کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ عوام النّاس کے یہ دونوں گروہ حق کو قبول کرنے میں کچھ آگے پیچھے ہوتے ہیں، لیکن دونوں ہی اس کو علیٰ وجہ البصیرت قبول کرتے ہیں اس وجہ سے وہ اس احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہتے ہیں جس کی وجہ سے سابق الذّکر گروہ مبتلا ہو جاتا ہے۔ ان کے دلوں پر سے حق کے مخالفین کا رعب بالکل اٹھ چکا ہوتا ہے۔ یہ دیکھ چکے ہوتے ہیں کہ ان لوگوں کے پاس اپنے رویّہ کو جائز ثابت کرنے کے لیے

ہٹ دھرمی اور ضد کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے۔ ان کی مکّاری، خود غرضی اور جعلسازی بھی ان کی نگاہوں کے سامنے پوری طرح آجاتی ہے، اس وجہ سے ان کی دیرینہ قیادت اور سابقہ عظمت کا احترام بھی ان کے دلوں سے نکل جاتا ہے۔ یہ بصیرت ان کے اندر احساسِ کمتری کے بجائے ایک احساسِ برتری پیدا کر دیتی ہے اور وہ ''بڑوں'' کی مخالفت سے جھجکنے اور ڈرنے کی جگہ ان کے مقابل میں حق کی حمایت کرتے ہوئے ایک غیر معمولی رفعت کا احساس کرتے ہیں۔ یہ چیز ان کو ذہنی اور اخلاقی پہلو سے اتنا اونچا کر دیتی ہے کہ اگر چہ اس کی تعداد تھوڑی ہو، اگر چہ ان کی تلواریں چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی ہوں، اگر چہ ان کے تیروں پر تکّوں کی پھبتی چست کی جاتی ہو، لیکن بڑے بڑے غرقِ آہن سورماؤں اور حسب ونسب اور جاہ وجلال رکھنے والے صنادید کے مقابل میں ان کو لا کر ان کے ذریعہ سے بدر کا معرکہ سر کیا جا سکتا ہے۔

ساتویں وجہ

ساتویں وجہ یہ ہے کہ کسی دعوت کی پائداری کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ ذہین اور اونچے طبقہ کے لوگوں میں سے اس کے لیے کارکن ملیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو اس دعوت کو پائداری نصیب نہیں ہوتی اور اہلِ بدعت بہت جلد اس میں رخنے پیدا کر کے ساری دعوت کو خراب کر ڈالتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اوپر گزر چکا ہے کہ بنی اسرائیل کے علماء داعیان میں سے کسی نے ان کی دعوت قبول نہیں کی، صرف عوام کے طبقہ سے ان کو کچھ شاگرد ملے۔ ان شاگردوں کے اخلاص، تقویٰ اور ادائے فرض میں شبہ نہیں ہے۔ ان کے بس میں جہاں تک تھا انھوں نے اس دعوت کو فروغ دینے کی پوری کوشش کی۔ لیکن اس کے باوجود پال نے بہت جلد دینِ مسیحی کو خراب کر ڈالا اور اپنے اس فساد میں اس نے جس چیز سے سب سے زیادہ کام لیا وہ اس کا یہ پروپیگنڈا تھا کہ مسیح ؑ کے شاگرد غیر تعلیم یافتہ عوام میں سے تھے، اس وجہ سے وہ مسیح ؑ کی تعلیمات کے اسرار ورموز کو

نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وہ خود چونکہ یونانی فلسفہ اور تصوّف کا ماہر تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ وہ مسیح ؑ کے براہِ راست شاگردوں سے زیادہ ان کی تعلیمات کو سمجھتا ہے اس وجہ سے عوام پر اس کا جادو چل گیا اور اس کا یہ پروپیگنڈا اس قدر موثر ہوا کہ اس کا مقابلہ نہ کیا جا سکا اور دینِ مسیحی نے بہت جلد ایک بالکل ہی مختلف شکل اختیار کر لی۔ اس کے برخلاف چونکہ اسلام کو قبول کرنے والے حضرات ابوبکرؓ وعمرؓ جیسے ذہین لوگ تھے اس وجہ سے اہلِ بدعت اس میں بہ آسانی رخنہ نہ پیدا کر سکے۔ بلکہ جہاں تک اسلام کی اصل دعوت کا تعلق ہے وہ ہزارہا انقلابات اور ہزارہا گردشوں اور اہلِ بدعت کی فتنہ انگیزیوں کے باوجود آج تک جوں کی توں باقی ہے۔

خاتمہ بحث

یہ وجوہ ہیں جن کی وجہ سے حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا طریقِ دعوت ہمیشہ یہ رہا ہے کہ انہوں نے پہلے ذہین طبقہ کو مخاطب کیا اور یہی طریقہ ان تمام حالات میں نتیجہ خیز ہو سکتا ہے جب کہ کسی جزوی اصلاح کی جگہ کلّی اصلاح کی ضرورت درپیش ہو۔ اگر کسی جگہ اسلام کا نظامِ حق قائم ہو اور اس کے اندر کوئی جزوی خرابی پیدا ہو گئی ہو اور اس کی اصلاح کرنی ہو تو اس صورت میں بلاشبہ صرف اسی گروہ کو مخاطب کیا جائے گا جو مذکورہ خرابی کا ذمہ دار ہے۔ لیکن جہاں سرے سے اسلامی نظام قائم ہی نہ ہو اور کسی جزوی اصلاح کی جگہ کلّی اصلاح کا معاملہ درپیش ہو، وہاں لازم ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے طریق پر دعوتِ عام بلند کی جائے اور اس دعوت میں سب سے پہلے اس ملک کے ذہین اور کارفرما عناصر کو خطاب کیا جائے، عام اس سے کہ وہ مسلمانوں کی قوم سے تعلق رکھتے ہوں یا غیر مسلموں سے۔ یہ سوال کے پہلے جزو کا جواب تھا۔ اب ہم سوال کے دوسرے حصہ پر بحث کریں گے۔

باب ۴

انبیائے کرام کا طریقۂ خطاب

یہ ظاہر ہے کہ انبیاء کی بعثت ہوتی ہی اس زمانہ میں ہے جب کہ حق و باطل میں امتیاز، وحی الٰہی کے بغیر، ناممکن ہوجاتا ہے اور عملاً تمام نظامِ زندگی حق کی جگہ باطل کے قبضہ میں آچکتا ہے۔ ایسے زمانہ میں حق صرف نبی کے ساتھ ہی ہوسکتا ہے۔ اس کے دائرہ سے باہر حق کے کچھ اجزاء تو پائے جا سکتے ہیں، لیکن پورے حق کا پایا جانا ناممکن ہے۔ اس وجہ سے اگر انبیائے کرام ابتدا ہی میں لوگوں کو اس طرح مخاطب کریں کہ اے کافرو! ایمان لاؤ۔ اے مشرکو! توحید اختیار کرو، تو صورتِ واقعہ کے اعتبار سے ان کا یوں دعوت دینا بے جا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ واقعہ یہی ہے کہ ان کے دائرے سے باہر جو کچھ ہے وہ صرف کفر و شرک ہی ہے، لیکن جن لوگوں نے حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ ایسا نہیں کرتے، بلکہ وہ لوگوں کو اے انسانوں، اے لوگو، اے میری قوم، اے اہلِ کتاب، اے لوگو جو یہودی ہوئے، اے وہ لوگو جو نصرانی ہوئے، اے وہ لوگو جو ایمان لائے، وغیرہ خطابات سے مخاطب کرتے ہیں اور ان کا یہی طرزِ خطاب اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک قوم ان کو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی اور حق دشمنی سے مایوس نہ کردے کہ ان کے لیے قوم سے علیحدگی اور ہجرت کا وقت آجائے۔ جب قوم اپنی حق دشمنی میں اس حد تک آگے بڑھ جاتی ہے کہ اہلِ حق کا وجود اپنے اندر کسی طرح گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی اور تائیدِ حق کی بڑی سے بڑی دلیل بھی اس کی ضد کے آگے بے کار ہو کے رہ جاتی ہے اس وقت انبیاء اپنی قوم کو چھوڑتے ہیں اور یہی وقت ہوتا ہے کہ وہ صاف صاف الفاظ میں ان لوگوں کے لیے کافر و مشرک وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو اپنے کفر و شرک پر اڑے رہتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ

یوں تو یہ حقیقت ہر نبی کی دعوت میں واضح ہے، لیکن خصوصیّت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مختلف مدارج پر جس شخص کی نظر ہوگی وہ اس حقیقت کا کسی طرح انکار نہیں کر سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو، اپنی قوم کو اور اپنے عہد کے بادشاہ کو جن الفاظ سے خطاب کیا ان میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ وہ مخاطب کو ایک کافر و مشرک کی حیثیت سے مخاطب کر رہے ہیں۔ لیکن دعوت و تبلیغ پر ایک مدت گزر گئی اور دلائل و معجزات کی ساری قوت قوم کی ضد کے مقابل میں نہ صرف بے اثر رہی، بلکہ یہ ضد اس قدر بڑھ گئی کہ پوری قوم ان کی جان کے درپے ہوگئی، اس وقت انہوں نے قوم سے علیحدگی کا اعلان کیا اور ایسے الفاظ میں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوم کے کفر و شرک کے ساتھ رواداری کی جو آخری حد ہو سکتی تھی وہ اب ختم ہو چکی ہے اور اب نہ صرف یہ کہ وہ ان کے کفر و شرک کا اعلان کرنا چاہتے ہیں، بلکہ قوم کے ساتھ اس وقت تک کے لیے اپنی نفرت و عداوت کا بھی اعلان کرنا چاہتے ہیں جب تک وہ توحید پر ایمان نہ لائے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (الممتحنہ ۶۰:۴)

”تمہارے لیے بہترین نمونہ تو ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ہے جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان سے، جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، بالکل بری ہیں۔ ہم نے تمہارا انکار کیا اور ہمارے اور تمہارے مابین ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بیزاری آشکارا ہوگئی تا آنکہ تم اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ پر ایمان لاؤ۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ

ٹھیک یہی حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا ہے۔ قربِ ہجرت سے پہلے کی کسی سورہ میں بھی یہ بات نہیں مل سکتی کہ آپ نے اپنی قوم کو یا اہلِ کتاب کو صریح طور پر کافر و مشرک یا منافق وغیرہ کے الفاظ سے مخاطب کیا ہو۔ بالکل ابتدائی سورتوں میں زیادہ تر خطاب یا تو 'یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ' کے الفاظ سے ہے یا 'یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ' یا 'یٰقَوْمِ' کے الفاظ ہیں۔ اسی طرح اہل کتاب کے لیے 'یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ' کے یا اس کے ہم معنی الفاظ ہیں۔ یہاں تک کہ منافقین کے لیے بھی فتح مکہ کے بعد تک وہی عام لفظ 'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' کا استعمال ہوتا رہا اور صراحت کے ساتھ ان کو 'اے منافقو' کے الفاظ سے کہیں خطاب نہیں کیا گیا۔ لیکن جب ایک مدّت کی دعوت و تبلیغ کے بعد قوم پر اللہ کی حجّت پوری ہوگئی اور نہ ماننے والوں نے نہ صرف یہ کہ مانا نہیں، بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کر لیا، اس وقت آپ نے ہجرت فرمائی اور کفّارِ قریش کو صاف صاف 'اے کافرو' کے الفاظ سے مخاطب کیا اور ان سے اور ان کے دین سے اپنی علیحدگی کا اعلان کیا۔ اسی ہجرت کے موقعہ پر یہ سورہ نازل ہوئی جو قریش سے اعلانِ برأت، بلکہ اعلانِ جنگ کی سورہ ہے:

قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ ﴿۱﴾ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲﴾ وَ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ﴿۳﴾ وَ لَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ﴿۴﴾ وَ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ﴿۵﴾ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ ﴿۶﴾ (الکفرون ۱۰۹: ۱-۶)

"کہہ دو: اے کافرو! نہ میں پوجوں گا جن چیزوں کو تم پوجتے ہو اور نہ تم پوجتے کے جسے میں پوجتا ہوں اور نہ میں پوجنے والا ہوا جن کو تم نے پوجا اور نہ تم پوجنے والے ہوئے جسے میں پوجتا آ رہا ہوں۔ تمھیں تمہارا دین اور مجھے میرا دین!"[1]

---

[1] عام طور پر اس سورہ کے آخری الفاظ کو لوگ رواداری کے اعلان پر محمول کرتے ہیں، لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ یہ دراصل اعلانِ برأت اور اعلانِ جنگ ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو امام حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ کی تفسیر سورۂ کافرون اور ہماری تفسیر، تدبر قرآن۔ جلد نہم۔

کافر اور مرتکبِ کفر میں فرق،

انبیائے کرام یہ ساری احتیاط صرف اس حد تک برتتے ہیں جہاں تک لوگوں کو کافر و مشرک قرار دینے کا معاملہ ہے۔ ان کے کافرانہ اور مشرکانہ اعمال کو کفر و شرک قرار دینے میں انبیائے کرام کبھی کوئی رعایت نہیں فرماتے۔ اس چیز میں اگر کسی وجہ سے وہ کوئی رعایت کرنا بھی چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اجازت نہیں دی جاتی اور سخت سے سخت مخالف حالات کے اندر بھی ان کو یہی ہدایت کی جاتی ہے کہ کسی کفر و شرک کو کفر و شرک قرار دینے میں نہ وہ کسی خطرہ کی پروا کریں اور نہ کسی مصلحت کا لحاظ کریں۔ اس کا سبب، العیاذ باللہ، یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ لوگوں کو کافر و مشرک قرار دینا چاہتے ہوں، لیکن محض فتنہ کے اندیشہ یا اس خیال سے کہ لوگ دعوت سے بدک جائیں گے، ایسا کرنے سے احتراز کریں۔ اس طرح کی مصلحت پرستی ان کے ہاں جائز ہوتی تو کفار جس طرح کے سمجھوتہ کی تجویزیں پیش کیا کرتے تھے وہ بڑی آسانی سے ان کو منظور کر کے سارا جھگڑا ختم کر دے سکتے تھے۔ لیکن معلوم ہے کہ کسی پیغمبر نے بھی دین کے بارہ میں کبھی اس طرح کی مصلحت کا لحاظ نہیں کیا، خواہ اس کی وجہ سے یہ سوال قابلِ غور ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ کفر و شرک کو کفر و شرک قرار دینے کے معاملہ میں جو لوگ اتنے بے خوف تھے انہوں نے کفر و شرک کے مرتکبین کو کافر و مشرک قرار دینے میں اتنی احتیاط کی اور ان سے برأت اور علیحدگی کے اعلان میں اتنی دیر لگائی!

اس فرق کی دو وجہیں

ہمارے نزدیک انبیائے کرام علیہم السلام اعمالِ کفر و شرک کو کفر و شرک قرار دینے کے باوجود ان کے مرتکبین کو کافر و مشرک قرار دینے اور ان سے اعلانِ برأت میں جو دیر لگاتے ہیں اس کی دو نہایت اہم وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ

پہلی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بندوں کو جو کچھ سرزنش وملامت ہے وہ اتمامِ حجّت اور تبلیغِ کامل کے بعد ہے۔ اگر اتمامِ حجّت اور تبلیغ کے بغیر لوگوں پر گرفت یا ان سے اظہارِ بیزاری جائز ہوتا تو اللہ تعالیٰ انبیاء کو مبعوث ہی نہ فرماتا۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ انبیائے کرام لوگوں کو کافر قرار دینے اور ان سے اعلانِ برأت کرنے سے پہلے ان کو اتنا موقعہ دیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی حجّت پوری ہو جائے اور ان کے انکار کے لیے ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کوئی اور وجہ باقی نہ رہ جائے۔ یہ کام ایک مدّت کی تبلیغ وتعلیم کا محتاج ہے۔ انبیاء کے وقفہ کے زمانہ میں جو تاریکی چھا جایا کرتی ہے وہ اتنی سخت ہوتی ہے کہ اس کے اندر خواص کو بھی راہِ حق سجھائی نہیں دیتی چہ جائیکہ عوام کالانعام۔ اس وجہ سے ہر گروہ تعلیم وتبلیغ کا محتاج ہو جاتا ہے اور چونکہ تمام گمراہیاں باپ دادا کی روایات بن کر دلوں میں رچ بس جاتی ہیں اور ان کے ساتھ کچھ لوگوں کے اغراض بھی وابستہ ہو جاتے ہیں اس وجہ سے اس بات کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کے مٹانے کے لیے ایک مدّت تک جہاد کیا جائے۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام پورے صبر واستقلال کے ساتھ ایک لمبی مدّت تک اس جہاد میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ حق اس قدر واضح ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں کے سوا جن کئے باطل کے ساتھ اغراض وابستہ ہوتے ہیں کوئی اور اس کا انکار نہیں کرسکتا۔ جب تبلیغ کا حق اس حد تک پورا ہو چکتا ہے تب انبیاء کے لیے یہ بات جائز ہوتی ہے کہ وہ منکرین کے کفر وشرک کا اعلان کر کے ان سے علیحدہ ہو جائیں۔

دوسری وجہ

دوسری وجہ یہ ہے کہ جب پوری سوسائٹی کا نظامِ حق کی جگہ باطل کی بنیاد ہی پر قائم ہو کر چلنے لگ جاتا ہے تو ان لوگوں کے لیے بھی حق کی پیروی ناممکن ہو جاتی ہے جو حق کی پیروی

کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت زندگی کے ہر گوشے میں فساد اس طرح گھس جاتا ہے کہ کسی محتاط سے محتاط آدمی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں رہ جاتا کہ وہ فساد کے کچھ جراثیم نگلے بغیر سانس لے سکے ـــــــ ایسی صورت میں اگر اس مجبوری کا لحاظ کیے بغیر انبیائے کرام لوگوں پر کفرو شرک کے فتوے جڑ کر ان سے برأت کا اعلان کر دیتے تو یہ بہتوں پر نہایت شدید ظلم ہوتا۔ اس وجہ سے وہ تکفیر اور اعلانِ برأت سے اپنا کام شروع کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی تبلیغ و دعوت سے ایسا ماحول پیدا ہو کہ اس کے اندر اہلِ حق اپنے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ یہ ماحول جب پیدا ہونے لگتا ہے اور زندگی کی وہ راہ کھل جاتی ہے جس پر حق پرست چل سکتے ہیں، اگر چہ یہ ابھی تنگ اور دشوار گزار ہی ہو، تب وقت آتا ہے کہ جو لوگ اس کو چھوڑ کر محض اپنی تن پروری اور جھوٹی نمائشوں کی خاطر باطل کی راہ پر بھاگے ہوئے چلے جا رہے ہیں ان کے کفر کا بھی اعلان کر دیا جائے اور ان سے علیحدگی بھی اختیار کر لی جائے۔

موجودہ حالات میں طریقۂ کار

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے اس اسوۂ حسنہ سے اگر ہم موجودہ حالات میں رہنمائی حاصل کریں تو یہ امر بالکل واضح ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں جو حالات ہیں وہ بہت سے اعتبارات سے انبیاء کے وقفہ کے زمانہ سے اشبہ ہیں۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب آج بے کم و کاست ہمارے اندر موجود ہے اس وجہ سے اس وقت دنیا کسی نبی کی ہدایت کی محتاج نہیں ہے اور نہ اب قیامت تک کسی نبی کی محتاج ہو گی۔ لیکن خلق کی رہنمائی اور مسلمانوں کو حق پر استوار رکھنے کے لیے ہمارا شرعی نظام تھا جو ایک مدت سے درہم برہم ہو چکا ہے۔ اس وجہ سے اس وقت دنیا جن خرابیوں اور گمراہیوں میں مبتلا ہو چکی ہے اس کے لیے وہ ایک بڑی حد تک معذور ہے۔ ہم اس کتاب کے باب ۲ میں اس بات کو وضاحت کے ساتھ لکھ چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کے لیے

اب دنیا پر اتمامِ حجّت کا فرض اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ڈالا ہے اور اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کی بتائی ہوئی صورت یہ ہے کہ مسلمان خلافت کا نظام قائم کریں جو ایک طرف دنیا کو نیکی اور بھلائی کے رستہ کی دعوت دے، دوسری طرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ سے مسلمانوں کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھے۔ خلافت کا نظام قائم نہ رہنے کی وجہ سے ان دونوں باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی پوری نہیں ہو رہی ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات پوری نہیں ہو رہی ہے، بلکہ عملاً ساری دنیا ایک باطل نظام کی گرفت میں آ چکی ہے اور باطل ایسی قوت وشوکت کے ساتھ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے کہ حق کے لیے موجودہ نظامِ زندگی میں کوئی جگہ سرے سے باقی نہیں رہ گئی ہے۔ نظامِ تعلیم، نظامِ تمدّن، نظامِ معاشرت، نظامِ سیاست، ہر چیز حق سے منحرف اور باطل کی مددگار ہے۔ یہاں تک کہ اس کے زیر سایہ اگر کوئی چھوٹا بڑا کام دین کے نام سے انجام دیا بھی جا رہا ہے تو وہ بھی اس وقت کی فضا کی ناسازگاری کی وجہ سے باطل ہی کو تقویّت پہنچا رہا ہے۔ نیک سے نیک انسان، جو فی الحقیقت نیکی اور سچائی کے راستہ ہی پر چلنا چاہتا ہے، آج چند قدم بھی بغیر مزاحمت کے حق کے راستہ پر نہیں چل سکتا۔ اگر دور والے اسے تھوڑی دیر کے لیے بخش دیتے ہیں تو قریب ہی والے اس سے الجھتے ہیں اور کسی طرح نہیں چاہتے کہ وہ اپنی منتخب کی ہوئی راہ میں دو قدم بھی آگے بڑھ سکے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ 'بدی کی راہ فراخ ہے اور اس پر چلنے والے بہت ہیں اور نیکی کی راہ تنگ ہے اور اس کے چلنے والے تھوڑے ہیں' یہ چیز آج آنکھوں سے مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ باطل کی منزل پر پہنچنے کے لیے فراخ سڑکیں ہیں، دورویہ درختوں کا سایہ ہے، تیز رو سواریاں ہیں، حفاظت کے لیے بدرقہ ہے، ہر منزل پر عیش و آرام ہے، آپ جس وقت چاہیں آرام سے منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس حق کی راہ پہلے ہی قدم پر رُندھی ہوئی ہے۔ اگر آپ ہمت کر کے اس مزاحمت کو دور کر لیں تو آگے کی راہ میں ہر قدم پر خطرہ ہے۔ یہاں تک کہ شروع سے لے کر آخرِ منزل تک خطرہ کے سوا کچھ ہے ہی نہیں اور

کسی شخص کے لیے بھی آج یہ ممکن نہیں ہے کہ سر لیے ہوئے اس راہ میں پاؤں رکھنے کی جرأت کر سکے۔ ایسے نازک اور پُر آشوب زمانہ میں یہ بات ذرا تعجب انگیز نہیں ہے کہ لوگ راہ سے بے راہ ہو گئے۔ تعجب انگیز اگر کوئی بات ہو سکتی ہے تو یہ ہو سکتی ہے کہ گمراہی کے اتنے سروسامان مہیا ہونے اور شیطان کے ایسے عالمگیر تسلّط کے باوجود، خدا کے کچھ بندوں کو اللہ کا نام یاد رہ گیا۔ یہ بے چارے داد کے مستحق ہیں نہ کہ ملامت کے اور سینہ سے لگا لیے جانے کے لائق ہیں نہ کہ کاٹ پھینکے جانے کے۔ جن لوگوں نے اتنے نامساعد حالات کے اندر اپنی شمع ایمان زندہ رکھی ہے اگر ان کو موافق حالات میسر آتے تو وہ بہتر سے بہتر مسلمان ہوتے۔ اس وجہ سے ان کی غلطیوں اور غیر شعوری گمراہیوں یا اضطراری ضلالتوں کی بنا پر ان کو ایمان سے محروم قرار دے کر ان سے نفرت کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ ان میں ایمان و اسلام کے صحیح مقتضیات کا شعور بیدار ہو۔

باب ۵

دعوتِ دین میں تدریج

انبیائے کرام علیہم السلام جس طرح لوگوں کو مخاطب کرنے میں ایک خاص ترتیب کا لحاظ رکھتے ہیں اور یہ ترتیب تبلیغ و دعوت کی ایک بڑی حکمت پر مبنی ہے جو اس ترتیب کو الٹ دینے کی صورت میں، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، مفقود ہو جاتی ہے، اس طرح جن باتوں کو انبیائے کرام پیش کرتے ہیں ان کو پیش کرنے میں بھی وہ ایک خاص تدریج کا اہتمام کرتے ہیں اور وہ تدریج بھی دعوتِ دین میں ایسی اہمیّت رکھتی ہے کہ اس کا اگر لحاظ نہ کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ نہ صرف ساری محنت اکارت ہو کے رہ جائے، بلکہ اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ اس سے الٹا دعوتِ دین کے مقصد کو نقصان پہنچ جائے۔ اس وجہ سے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ جس طرح ہم نے تفصیل کے ساتھ یہ بات واضح کر دی ہے کہ تبلیغِ دین کے لیے لوگوں کو مخاطب کرنے میں کیا ترتیب اختیار کی جائے اسی طرح تفصیل کے ساتھ یہ بات بھی بیان کر دیں کہ دین کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے میں کیا تدریج ملحوظ رکھی جائے۔

انبیاء کی دعوت کے مبادی

چونکہ انبیاء کی بعثت ہمیشہ ایسے زمانے میں ہوتی ہے جب نظامِ حق بالکل درہم برہم ہو چکا ہوتا ہے اور ایک جاہلی نظام پوری سوسائٹی کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے، اس وجہ سے وہ سب سے پہلے ان مبادی کی دعوت بلند کرتے ہیں جن کی بنیادوں پر خالص اسلامی

سوسائٹی کی تعمیر ہوتی ہے۔ یہ مبادی تین ہیں:

۱۔ خدا پر ایمان، کامل توحید کے ساتھ۔

۲۔ رسالت پر ایمان، کامل اطاعت کے ساتھ۔

۳۔ آخرت پر ایمان، کامل تفویض کے ساتھ۔

یہی تین چیزیں ہیں جن کے اندر خرابی پیدا ہونے سے سوسائٹی جاہلیّت کی طرف کھسکنی شروع ہوتی ہے اور جب ان میں پوری طرح فساد سرایت کر جاتا ہے تو پوری سوسائٹی پر جاہلیّت کی ظلمت چھا جاتی ہے اور انہی تینوں چیزوں کے آشکارا ہونے سے سوسائٹی اسلام کی طرف بڑھنا شروع کرتی ہے اور جب یہ پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آ جاتی ہے تو سوسائٹی پورے دن کی روشنی میں آ جاتی ہے۔ ان تینوں چیزوں کا اعتقاد انسانی فطرت کے اندر اتنا راسخ ہے کہ دنیا میں ان کا انکار بہت کم کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ شیطان کو اچھی طرح علم ہے کہ انہی چیزوں پر نظامِ حق کی بنیادیں قائم ہیں اس وجہ سے اس کی ساری کوشش ہمیشہ اس بات کے لیے رہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان میں کوئی نہ کوئی رخنہ ضرور پیدا کرے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جس طرح ان کا انکار بہت کم کیا گیا ہے اسی طرح شیطان کی کوششوں کا اثر یہ ہے کہ ان کا صحیح صحیح اقرار بھی بہت کم کیا گیا ہے۔ ان عقائد کے باب میں دنیا کی اصلی روش نہ انکار کی رہی ہے نہ ہمیشہ صاف صاف اقرار کی، بلکہ بیشتر اقرار مع الانکار کی رہی ہے اور یہی وہ گرہ ہے جو اس رشتہ میں بار بار پڑتی رہی ہے اور جس کو کھولنے کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجتا رہا ہے۔

دعوت کی راہ کی ایک شکل

یہ حق و باطل دونوں کی ملاوٹ دعوت و اصلاح کے کام کو بہت مشکل اور دیر طلب بنا دیتی ہے۔ اگر مقابلہ صرف باطل سے ہو تو اس کو آسانی سے سر کیا جا سکتا ہے، لیکن جہاں حق و باطل دونوں ملے جلے ہوئے ہوں اور باطل کی حمایت کے لیے حق کو سپر کے طور پر استعمال

کیا جا رہا ہو وہاں حق کی حمایت میں کوئی فیصلہ کن اقدام کرنے سے پہلے داعیانِ حق کو ایک جہادِ عظیم اس مقصد کے لیے کرنا پڑتا ہے کہ وہ لوگوں پر یہ آشکارا کر سکیں کہ زیرِ بحث نظام میں اگر کچھ اجزاء حق کے ہیں تو وہ حق کی خاطر نہیں ہیں، بلکہ باطل کی خدمت کے لیے ہیں۔ انبیائے کرام کو ان لوگوں کو جو دنیا کو راہِ راست کی دعوت دیتے ہیں بالعموم ایسے ہی فاسد العقیدہ لوگوں سے کشمکش کرنی پڑتی ہے جو خدا کے دین اور اپنے نفس کی خواہشوں میں مصالحت کرا کے ایک نیا نظام کھڑا کرتے ہیں اور اس کو پرانے نظام کا نام دے لیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ اپنے باطل کی حفاظت کے لیے چونکہ حق کو سپر بنائے ہوئے ہوتے ہیں، اس وجہ سے ان پر پوری آزادی کے ساتھ بیک دفعہ ضرب نہیں لگائی جا سکتی، بلکہ آہستہ آہستہ ان کے اعمال و معتقدات میں سے حق کے اجزاء کو الگ اور باطل کے اجزاء کو الگ کرنا پڑتا ہے اور چونکہ ان کا ہر باطل حق بن کر بچ چکا ہوتا ہے اس وجہ سے اس کی جدائی ان کو اتنی شاق گزرتی ہے کہ وہ ان میں سے ایک ایک پر مورچے قائم کرتے ہیں اور اس وقت تک اس کو نہیں چھوڑتے جب تک اس کی حمایت سے بالکل ہی مایوس نہ ہو جائیں۔ یہ کام بڑا دیر طلب ہے۔ اس میں بڑی دیدہ ریزی، بڑے صبر اور بڑے حلم کی ضرورت پڑتی ہے اور ساتھ ہی بے لاگ حق پرستی بھی اس راہ میں مطلوب ہوتی ہے۔ کیونکہ جن لوگوں کے متعلق آدمی کا خیال یہ ہو کہ ان کے انکار کے ساتھ اقرار بھی شامل ہے، قدرتی طور پر ان کے ساتھ جو معاملہ کرتے ہیں وہ نرمی کی طرف مائل ہوتا ہے اور اس نرمی کا بڑا فائدہ باطل کو حاصل ہوتا ہے نہ کہ حق کو۔

تعلیم میں دو باتوں کا لحاظ

اس کشمکش کے نتیجہ کے طور پر جو لوگ حقِ خالص کا ساتھ دینے اور باطل سے اپنا رشتہ یک قلم منقطع کر لینے پر صدقِ دل کے ساتھ آمادہ ہو جاتے ہیں وہ لوگ ایک جماعت بن جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو انبیائے کرام ان باتوں کی تعلیم شروع کرتے ہیں جن سے، ایک تو

وہ خدا سے بہتر سے بہتر طریق پر جڑ جائیں، دوسری طرف تو آپس میں ایک بنیانِ مرصوص کی طرح مربوط ہو جائیں۔ یہ خدا اور بندوں سے ٹھیک ٹھیک جوڑ دینے والے اصول انہی تین اصولوں سے نکلے ہوئے ہوتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔ اس وجہ سے ان لوگوں کو ان کے قبول کر لینے میں کوئی زحمت نہیں ہوتی جو ان تین اصولوں کو مان چکے ہیں۔ ایک اصول کو مان لینے کے بعد کوئی دیانت دار شخص اس کے لازمی نتائج کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایک شے کے لوازم کی حیثیت تو درحقیقت اجمال کے بعد تفصیل کی ہوا کرتی ہے، لیکن اس تفصیل کو بھی انبیائے کرام مجرّد اس اعتماد پر کہ جن لوگوں نے اصول تسلیم کر لیے ہیں وہ لازماً ان کے نتائج کو بھی مان ہی لیں گے، یوں ہی بے ترتیب لوگوں کے سامنے پھینکنا نہیں شروع کر دیتے، بلکہ ایک حکیمانہ ترتیب و تدریج کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اسی ترتیب و تدریج کے اندر ان کے مشن کی کامیابی کا اصل راز مضمر ہوتا ہے۔ اس ترتیب میں دو پہلو مدِّنظر ہوتے ہیں: ایک جماعت کی ذہنی استعداد کا، دوسرا جماعت کی اجتماعی استطاعت کا۔ یہ دونوں چیزیں کسی قدر وضاحت کی محتاج ہیں۔

ذہنی استعداد

ذہنی استعداد سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ دین کے احکام و تعلیمات میں ایک نظم (سسٹم) ہے۔ اس کے کچھ بنیادی کلیّات ہیں، ان سے کچھ مبادی پیدا ہوتے ہیں، پھر ان سے اصولی تعلیمات پیدا ہوتی ہیں، پھر ان سے جزئیات و فروع وجود میں آتی ہیں۔ جو شخص اس ترتیب و تدریج کے ساتھ دین کو سیکھتا ہے، وہ ایک طرف تو ہر مرحلہ میں دوسرے مرحلہ کے لیے اپنے اندر استعداد پیدا کر لیتا ہے، دوسری طرف اس پورے سسٹم سے واقف ہو جاتا ہے جو اس کے اندر موجود ہے۔ اس کی مثال بالکل یوں ہے کہ ایک بچہ کو پہلے حروف تہجی کی تعلیم دی جائے، پھر ان کو آپس میں جوڑنا اور ملانا سکھایا جائے، پھر اس کو الفاظ اور جملوں کے پڑھنے کی مشق کرائی جائے، پھر اس کے سامنے پڑھنے کے لیے ایک پوری عبارت رکھ

دی جائے۔ چونکہ وہ حروف سے عبارت تک درجہ بدرجہ اس سسٹم کو سمجھتا ہوا آیا ہے، جو اس کے اندر ملحوظ ہے، اس وجہ سے ہر منزل میں اس نے آگے کی منزل کے لیے استعداد خود بخود بہم پہنچالی ہے اور کوئی چیز اس کی طبیعت پر بار نہیں ہوئی ہے، بلکہ ہر استعداد چونکہ فطرۃً فعل چاہتی ہے۔ اس وجہ سے اس نے ایک درجہ سے دوسرے درجے میں منتقل ہونے کے لیے اپنی طبیعت کے اندر خود ایک تقاضا محسوس کیا ہے۔ اس کے برعکس جس شخص نے دین کو اس طرح نہیں پایا ہے، بلکہ اس کے مختلف حصے اس کے سامنے بے ربط و بے ترتیب رکھ دیے گئے ہیں اس کی مثال بالکل اس بچہ کی ہے جس کو تمام ابتدائی مراحل سے گزرے بغیر کوئی عبارت رٹا دی گئی ہو جس کو وہ رٹ تو لے گا اور حافظہ کی مدد سے اس کو دُہرا بھی سکے گا، لیکن وہ ہمیشہ اس کے حافظہ پر ایک بار بنی رہے گی، کبھی اس کی استعداد کا جزو نہیں بن سکے گی۔ انبیائے کرام علیہم السلام دین کو پیش کرنے میں یہ طریقہ کبھی اختیار نہیں کرتے، بلکہ فطری اور حکیمانہ ترتیب اختیار کرتے ہیں تاکہ جو لوگ اس کو قبول کریں، اپنی طبیعت کی طلب سے قبول کریں اور پورا دین ان کے فکر ونظر اور روح و دل کے اندر جذب ہو جائے۔ اسی چیز سے وہ رسوخِ ایمان پیدا ہوتا ہے جو آروں سے چیر ڈالے جانے کے بعد بھی دلوں سے نہیں نکلتا اور اسی سے وہ ذوقِ تقویٰ پرورش پاتا ہے جو زندگی کے پھیلے ہوئے معاملات کے بعید ترین گوشوں میں بھی کوئی چیز روحِ دین کے خلاف برداشت نہیں کرسکتا۔

جو لوگ دین کے اس نظام کو اور انبیائے کرام کے اس طریقِ دعوت کی خوبیوں کو نہیں سمجھتے ہیں وہ لوگ معرفتِ الٰہی پیدا کرنے سے پہلے لوگوں کو نہ صرف فرض نمازوں کا بلکہ تہجد و اشراق تک کا پابند بنانا چاہتے ہیں۔ وہ نبی کی ضرورت اور اس کی اطاعت و پیروی کا اعتقاد پیدا کرنے سے پہلے لوگوں کو ڈاڑھیوں، لبوں اور پائجاموں کی پیمائش کرتے پھرتے ہیں۔ وہ آخرت پر سچا اور پکا ایمان پیدا کرنے سے پہلے لوگوں پر خشیت، تقویٰ، تواضع اور فروتنی کا جمال دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان الٹی کوششوں سے ایک حد تک ڈاڑھیاں لمبی تو ہو جاتی ہیں، ازاریں اپنے حد کے اندر تو آجاتی ہیں، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، ہنسنے بولنے، ہر چیز

میں ایک مصنوعی مسکینی تو نمایاں ہو جاتی ہے، کھانے پینے، کھانسنے اور چھینکنے، ہر چیز میں پابندی سنت کا التزام واہتمام بظاہر پیدا تو ہو جاتا ہے،لیکن چونکہ یہ سب کچھ غیر عقلی اور غیر فطری طریقہ پر پیدا کیا جاتا ہے، اس وجہ سے اس تمام ہمہمہ تقویٰ کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی کہ 'مچھر چھانے جاتے ہیں اور اونٹ نگلے جاتے ہیں'۔ اس طرح کے اتقیاء یہ نہیں دیکھتے کہ جو لقمہ حلق سے جا رہا ہے وہ پاک وطیب ہے یا طاغوت کی خدمت کر کے حاصل کیا گیا ہے، لیکن اس امر کا انتہائی اہتمام کرتے ہیں کہ اس لقمۂ حرام کو کھانے کے بعد پانی داہنے ہی ہاتھ سے پئیں، بائیں ہاتھ سے نہ پئیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا دینی تصوّر یہ ہے کہ اگر ایک شخص کی نیت خالص ہے تو وہ کسی نظامِ باطل کے اندر تھانہ داری، ڈپٹی کمشنری اور کونسلوں کی ممبری سب کچھ کر کے اللہ کو راضی اور اسلام کے جھنڈے کو اونچا کر سکتا ہے۔ انہی متقیوں کے اندر ایسے لوگ بھی آپ کو مل جائیں گے جو اپنی خوش قسمتی پر بہت نازاں ہیں کہ انہیں اپنی لڑکی کے لیے ایسا دیندار بر ملا ہے کہ اس کی ازار ٹخنوں سے کبھی نیچے نہیں ہوتی اور فُلاں حضرت، کا مرید ہے، لیکن ان کی نظر اس بات پر نہیں جاتی کہ اس نے اپنی معاش کے لیے جو ذریعہ اختیار کیا ہے کوئی مسلمان حسِ ایمانی رکھتے ہوئے اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سارا بے تُکا پن درحقیقت نتیجہ ہے اس بات کا کہ ایک مدّت سے مسلمانوں کے اندر کوئی ایسی دعوت نہیں اٹھی جو ان کے سامنے ان کے پورے دین کو اس کے سسٹم کے ساتھ پیش کرتی اور تبلیغ ودعوت کے ہر مرحلہ میں دین کا جس قدر حصّہ لوگوں کو دیتی اس کے پورے مقتضیات ان پر واضح کر دیتی۔ بلکہ جن لوگوں نے بھی اس سلسلہ میں کوئی کام شروع کیا۔ اصلی ضرورت کا شعور اور نظامِ دین کی معرفت نہ ہونے کی وجہ سے جہاں سے چاہا شروع کیا اور جہاں چاہا ختم کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن مسلمانوں کے اندر کچھ دینی شعور ہے بھی وہ اس قدر الٹا اور بے جان ہے کہ اس کو کسی صحیح دعوت کے لیے بنیاد بنانا تو درکنار اس کو قائم رکھ کر کوئی صحیح دعوت شاید شروع بھی نہیں کی جا سکتی۔

جماعتی استطاعت

اب اسی طرح بالا جمال اس اجتماعی استطاعت کی حقیقت پر غور کیجئے جس کو حضرات انبیائے کرام علیہم السلام دین کو پیش کرنے میں ملحوظ رکھتے ہیں۔ دین کے احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو طرح کے ہیں: ایک انفرادی احکام، دوسرے اجتماعی احکام۔ انفرادی احکام افراد کے لیے ہوتے ہیں اور ہر فرد کے لیے اس کی انفرادی حیثیت ہی میں ان کی تعمیل ضروری ہے، مثلاً نماز، روزہ، انفاق وغیرہ۔ اجتماعی احکام کا تعلق جماعت سے ہے۔ جب جماعت وجود میں آجائے تو یہ اس کا فرض ہے کہ ان کی تعمیل کرے، مثلاً وہ احکام جو معاشرت وسیاست اور جہاد سے متعلق ہیں۔ پہلی قسم کے احکام کی تعلیم ودعوت میں افراد کے تحمل اور ان کی قوتِ برداشت کا لحاظ ہوتا ہے کہ احکام وقوانین ان پر بارش کی طرح برسا نہ دیے جائیں کہ وہ گھبرا کے سب کچھ چھوڑ بیٹھیں۔ دوسری قسم کے احکام میں جماعت کے تحمل کا اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس قابل ہے بھی کہ نہیں کہ جو احکام اس کو دیے جا رہے ہیں ان کا بوجھ اٹھا سکے۔ اس جماعتی استطاعت کا لحاظ نہایت ضروری بھی ہے اور اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہایت مشکل بھی ہے۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کو تو اس معاملہ میں براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی ہوتی ہے، کیونکہ ان کے اوپر احکام وقوانین نازل ہی جماعت کی قوّت و استعداد کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔ البتہ جو لوگ انبیاء کے طریقہ پر کسی جماعت کو اٹھانا چاہتے ہوں، ان کو اس معاملہ میں سرتاسر اجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے اور جب تک انہیں احکامِ دین کی ترتیبِ نزول، اپنے وقت کے خاص حالات اور ایک نبی اور غیر نبی کی جماعت کے فرق کا پورا پورا اندازہ نہ ہو، کبھی ان کا قدم صحیح راہ پر نہیں پڑ سکتا اور ہر وقت اس بات کا اندیشہ ہے کہ جس جماعت کی وہ قیادت کر رہے ہیں اس کی کشتی ساحل پر پہنچنے سے پہلے ہی کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔

جو لوگ اس امر سے واقف نہیں ہیں وہ پورے قرآن مجید کو اپنے سامنے دیکھ کر یہ سمجھتے

ہیں کہ یہ پورا کا پورا ایک ہی دن میں اتارا گیا تھا اور اس پورے کے پورے کو ایک ہی دن میں جاری و نافذ ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ وہ ایک طرف توحید کی دعوت شروع کریں گے، دوسری طرف اسلامی نظامِ قضا کی داغ بیل بھی ڈال دیں گے۔ ایک طرف کفر بالطّاغوت کی شرح شروع کریں گے، دوسری طرف طاغوت کو الٹی میٹم بھی بھیج دیں گے۔ ان باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عام طور پر مسلمانوں کو اس بات کی بالکل خبر نہیں ہے کہ کسی سرزمین کے نظامِ جاہلی کو نظامِ اسلامی سے بدل دینے کے لیے جو دعوت اٹھتی ہے اس میں جماعت کی اجتماعی قدرت و استطاعت کا کس قدر صحیح اندازہ کر کے قدم اٹھانا پڑتا ہے اور اگر اس اندازہ میں ادنیٰ غلطی بھی ہو جائے تو کیا خطرے متصور رہیں؟

یہاں اس بات کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے کہ قرآن میں معاشرت اور سیاست سے متعلّق سارے احکام اس وقت نازل ہوئے جب کہ دارالاسلام بالفعل قائم ہو چکا تھا اور ان احکام کے نازل ہونے میں بھی ایک ترتیب و تدریج ہے اور ترتیب و تدریج جماعت کی استطاعت کے بالکل متوازی ہے۔ جب مسلمان اتنی تعداد میں ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی ایک علیحدہ ہیّتِ اجتماعی کی تشکیل کر سکتے ہیں اور اس مقصد کے لیے انہیں ایک آزاد گوشۂ زمین بھی مل جاتا ہے، تب انہیں نظامِ کفر سے قطعِ تعلّق کا آخری حکم دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جب مسلمانوں کی جماعتی قوّت کم از کم اتنی ہو جاتی ہے کہ وہ کفر کے مقابلے میں ٹِک سکیں، تب انہیں لڑائی کے لیے تلوار اٹھانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جب مسلمان اس حیثیّت میں ہو جاتے ہیں کہ وہ ایک مستقل نظامِ معاشرت و نظامِ معیشت کو چلا سکیں، تب انہیں نظامِ کفر سے ہر طرح کے معاشرتی قطعِ تعلّق کا حکم دیا جاتا ہے اور اسلام کے وہ قوانین و احکام نازل ہوتے ہیں جو مدنی و اجتماعی زندگی سے متعلق ہیں۔ پھر جب مسلمان وہ سیاسی قوّت بہم پہنچا لیتے ہیں کہ بغیر کسی اندیشۂ مزاحمت کے خدا کی زمین پر خدا کے احکام کو جاری و نافذ کر سکتے ہیں، تب ان کو وہ احکام و قوانین دیے جاتے ہیں جن کا تعلّق بین الاقوامی سیاست سے ہے۔ ایک طالب علم کی ذہنی استعداد کی طرح ایک جماعت کی مادی استعداد

بھی تدریجاً ہی بڑھتی ہے اور جو لوگ کسی جماعت کی قیادت کرتے ہیں ان کو سب سے زیادہ بیدار مغزی کے ساتھ جماعت کی اس استعداد ہی کا اندازہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس کا صحیح صحیح اندازہ کیے بغیر جماعت پر کوئی بوجھ ڈال دیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو استعداد اس نے ایک مدّت میں فراہم کی ہے وہ ساری کی ساری برباد ہو جائے گی۔

اسی حقیقت کی طرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اشارہ فرمایا ہے:

اِنّما نزل اوّل ما نزل منه سورةٌ من المفصّل فيها ذكر الجنّة والنّار ـــــــ حتىّٰ اذا ثاب النّاس الى الاسلام نزل الحلالُ والحرامُ ـــــــ ولو نزل اوّل شيء: لا تشربوا الخَمْرَ لقالوا لا نَدَعُ الخمرا بدًا۔ ولو نزل: لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابدًا[1]

"قرآن میں سب سے پہلے جو چیز نازل کی گئی وہ مفصّل کی ایک سورہ ہے جس میں دوزخ اور جنّت کا ذکر ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کے دائرے میں آ گئے تب حلال وحرام کے احکام اترے۔ اور اگر بالکل شروع ہی میں حکم آ جاتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے کہ ہم ہرگز شراب نہ چھوڑیں گے۔ اور اگر یہ حکم دیا جاتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم ہرگز زنا نہ چھوڑیں گے۔"

---

[1] صحیح البخاری: کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن

باب ٦

دعوت کے طریقے

بعض دینی حلقوں میں خدا جانے یہ خیال کہاں سے پھیل گیا ہے کہ تبلیغ کا معیاری اور پیغمبرانہ طریقہ یہ ہے کہ آدمی ہاتھ میں ایک لٹھیا اور جھولی میں تھوڑے سے چنے لے لے اور تبلیغ کے لیے نکل کھڑا ہو۔ نہ پاؤں میں جوتی ہو نہ سر پہ ٹوپی، گاؤں گاؤں میں پھرے اور جس جگہ کوئی شخص مل جائے، خواہ وہ سنے نہ سنے، اس پر تبلیغ شروع کر دے۔ اگر کسی شہر میں گزر ہو تو وہاں جس نکڑ یا چورائے پر چار آدمی نظر آ جائیں وہیں تقریر کے لیے کھڑا ہو جائے۔ ریل میں، سٹیشن پر، بازار میں، سڑک پر جس جگہ کوئی بھیڑ مل جائے وہیں اُس کا وعظ شروع ہو جائے۔ ہر مجلس میں گھس جائے۔ ہر کانفرنس میں اپنی جگہ پیدا کر لے۔ ہر پلیٹ فارم پر جا دھمکے۔ سننے والے تھک تھک جائیں، لیکن وہ سنانے سے نہ تھکے۔ لوگ اس کے تعاقب سے گھبرا گھبرا جائیں، لیکن وہ خدائی فوجدار بنا ہوا ہر ایک کے سر پر مسلّط رہے۔ لوگ اس کے سوال و جواب کے ڈر سے چھپتے پھریں، بلکہ بسا اوقات آزردہ ہو کر گستاخیاں اور بدتمیزیاں بھی کر بیٹھیں، لیکن وہ اسی انہماک و جوش کے ساتھ اپنا کام جاری رکھے۔ جہاں وعظ کی فرمائش کی جائے، وعظ کہہ دے۔ جہاں میلاد کی خواہش کی جائے، میلاد پڑھ دے۔ اور جہاں مخالفین و منکرین سے سابقہ پڑ جائے، وہاں خم ٹھونک کے میدانِ مناظرہ میں بھی اتر پڑے۔ یہ ہے تبلیغ کا اصلی طریقہ اور یہ ہے ایک سچے مبلّغ کی صحیح تصویر جو ہمارے بہت سے دین دار لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے۔ تبلیغ و تعلیم کے موجودہ ترقی یافتہ اور سائنٹیفک طریقوں کے تھوڑے بہت مفید ہونے سے ممکن ہے یہ لوگ منکر نہ ہوں، لیکن خیرو

برکت والا طریقہ ان کے نزدیک یہی ہے جس کو، ان کے خیال میں، حضرات انبیاء نے اختیار فرمایا۔

ہمارے نزدیک اس طریقہ کو انبیاء کا طریقہ سمجھنا کچھ تو انبیاء کے طریقہ سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے اور کچھ ان حضرات کی اس خواہش کا کہ ان کا اپنا اختیار کیا ہوا طریقہ ——— جس کے سوا کسی اور طریقہ کو اختیار کرنے کے صلاحیت سے محروم ہیں ——— ایک محترم و مقدس طریقہ ثابت ہو جائے۔ انبیاء کے طریقۂ تبلیغ کا جہاں تک ہم نے مطالعہ کیا ہے اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام نے تبلیغ کے جو طریقے اختیار کیے ہیں وہ ان کے زمانوں کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ و ترقی یافتہ طریقے تھے اور یہ طریقے حالات کے تغیر اور تمدنی ترقیوں کے ساتھ ساتھ بدلتے بھی رہے ہیں۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس معاملہ میں کسی ایک ہی طریق پر اصرار صحیح نہیں ہے۔ بلکہ داعیانِ حق کو چاہیے کہ وہ ہر زمانہ میں تبلیغ و تعلیم کے لیے وہ طریقے اختیار کریں جو ان زمانوں میں پیدا ہو چکے ہوں اور جن کو اختیار کر کے وہ اپنی کوششوں اور قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز بنا سکتے ہوں۔

علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ دعوت کے طریقوں میں ترقی

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز یہ ہے کہ انبیائے کرام نے تبلیغ کے کام میں جیسا کہ عرض کیا گیا، کسی ایک ہی طریقہ پر اصرار نہیں کیا ہے بلکہ جس رفتار سے دنیا میں علم و فن ترقی کرتا گیا ہے اسی اعتبار سے ان کی تبلیغ و تعلیم کے طریقے بھی بدلتے گئے ہیں۔ ابتدائی دورِ تمدن میں، جب لکھنے پڑھنے کا فن وجود میں نہیں آیا تھا، انبیاء کی تعلیم و تبلیغ بھی زبانی تھی۔ نیکی اور سچائی کے کچھ اصول وہ لوگوں کو زبانی آ کر تلقین کر دیتے اور لوگ ان کو یاد کر لیتے جو نسلاً بعد نسل، روایات کی شکل میں، ان کے ماننے والوں میں منتقل ہوتے رہتے۔ یہاں تک کہ جب امتدادِ زمانہ سے وہ اصول فراموش ہو جاتے یا ان کے اندر دوسری آمیزشیں ہو جاتیں تو اللہ تعالیٰ کسی اور نبی کو بھیجتا جو آ کر اس تعلیم کو ازسرِ نو تازہ کر دیتا۔

جب تک تحریر کا فن ایجاد نہیں ہوا تبلیغ کے معاملے میں سارا اعتماد صرف شخصی ارتباط، زبانی اظہار و بیان اور سامعین کی قوّتِ حافظہ پر رہا۔ لیکن جب انسان نے تحریر کا فن ایجاد کر لیا اور لوگوں تک کسی چیز کے پہنچانے اور اس کو ان کے اندر محفوظ رکھنے کا ایک اور ترقی یافتہ طریقہ پیدا ہو گیا تو انبیائے کرام نے اس کو بھی اختیار فرما لیا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے زبانی تلقین کے بجائے تورات کے احکام اپنی قوم کو تختیوں پر لکھ کر دیے۔ اسی طرح عربوں کو دین کی تعلیم قلم ——— تحریر ——— کے ذریعہ سے دی گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان پر اس بات کا احسان جتایا ہے کہ ان کو صرف زبانی تعلیم کے بجائے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی گئی ہے، جو تعلیم کا ایک اعلیٰ اور محفوظ ترین ذریعہ ہے:

اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ۝ (العلق۹۶: ۳-۵)

"پڑھ اور تیرا رب بڑا ہی کریم ہے، جس نے تعلیم دی قلم کے واسطہ سے۔ اس نے سکھایا انسان کو وہ کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا۔"

ان آیات سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ اس نے انسان کو قلم کے استعمال کا ڈھنگ سکھایا اور پھر اس کے اس ترقی یافتہ طریقہ کو تعلیم دین کا ذریعہ بنایا جس کی وجہ سے وہ لائق ہوا کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ——— کتاب ——— بخشی جائے۔ زبانی تعلیم کے مقابلے میں قلم اور کتاب کی تعلیم کو جو ترجیح حاصل ہے اور اس میں اتمامِ حجّت اور تبلیغ کامل کے جو پہلو ہیں، ان کی طرف قرآن نے جگہ جگہ اشارات کیے ہیں، لیکن یہ موقع اس کی تفصیل کا نہیں ہے۔ یہاں ہم جس بات کو سامنے لانا چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ انبیاء کا طریقۂ تبلیغ کوئی جامد طریقہ نہیں ہے، بلکہ انسان کی علمی و ذہنی ترقیوں کے ساتھ ساتھ اس میں تبدلیاں اور ترقیاں ہوتی رہی ہیں۔ اس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ سائنس اور تمدّن کی ترقی سے انسان کے وسائلِ کار اور ذرائع معلومات میں جو اضافے ہوئے ہیں، ان سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا حق

داعیانِ حق کو ہے۔ مثلاً آج پریس، سینما، ریڈیو اور ٹیلی ویژن وغیرہ نے انسان کے پروپیگنڈے اور تعلیم وتبلیغ کی قوّت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ ایک بڑی سے بڑی تقریر چند منٹوں کے اندر اندر دنیا کے ایک گوشہ سے لے کر دوسرے گوشہ تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ کسی وسیع سے وسیع تحریک سے چند دنوں کے اندر اندر دنیا کے تمام پڑھے لکھے انسانوں کو آشنا کیا جا سکتا ہے۔ مشکل سے مشکل باتیں بہت معمولی محنت سے عوام وخواص سب کے ذہن نشین کرائی جا سکتی ہیں۔ اس زمانہ میں اہلِ باطل انہی ذرائع سے کام لے کر اپنے جس باطل کو چاہتے ہیں دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیتے ہیں۔ ان ایجادات نے دنیا کی تمام دوریوں اور تمام فاصلوں کو لپیٹ کر رکھ دیا ہے۔ قوموں اور قوموں کے درمیان اب سمندروں اور پہاڑوں کے پردے کوئی روک نہیں بن سکتے ہیں۔ کل تک ایک سکول کا ماسٹر جس طرح اپنی بات اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بچوں کو سنا سکتا تھا، آپ آج چاہیں تو اسی طرح اس پورے کرّہ ارض کے انسانوں کو اپنی بات سنا سکتے ہیں۔ کل تک جس چیز کی تعلیم پر مہینوں اور سالوں صرف کر کے آپ اس کو ذہنوں میں راسخ نہیں کر سکتے تھے، آج اگر چاہیں تو موجودہ سائنٹیفک ذرائع سے کام لے کر کسی شہر کے عوام وخواص، سب کو چند گھنٹوں کے اندر اندر اس کا عالِم بنا دے سکتے ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ آج حق کی تبلیغِ دین کے لیے ان ذرائع پر قبضہ کیا جائے۔ اگر اہلِ حق یہ خیال کر کے ان چیزوں کو نظر انداز کر دیں کہ انبیاء نے تبلیغِ دین کے کام میں ان چیزوں کو استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ ایک ایک شخص کے پاس پہنچ کر ہی اس پر تبلیغ کی ہے۔ اس وجہ سے ہمارے لیے بھی اولیٰ یہی ہے کہ ہم ان چیزوں کو ہاتھ نہ لگائیں، بلکہ گھر گھر پہنچ کر ہی لوگوں کو تبلیغ کریں تو یہ انبیاء کے طریقے کی پیروی نہیں ہوگی۔ بلکہ یہ شیطان کا ایک بہت بڑا دھوکا ہوگا جو وہ آپ کو اس لیے دے رہا ہے کہ جب تک آپ اپنے دین دارانہ طریقہ پر چل کر دو آدمیوں سے کوئی بات کہیں، اس وقت وہ ان سائنٹیفک وسائل سے کام لے کر ہزاروں لاکھوں، بلکہ کروڑوں انسانوں تک اپنی دعوتِ باطل نہایت مؤثر طریقہ پر پہنچا دے۔ شیطان نے اسی طرح کے

دھوکے دے کر اکثر اہلِ حق کی کوششوں اور قابلیتوں کو نقصان پہنچا دیا ہے اور ان کے مقابل میں خود اپنا پلّہ بھاری رکھا ہے، یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اب زندگی کے ہر میدان میں یہ پیچھے ہو گئے ہیں اور وہ آگے آگے قوموں کی امامت کر رہا ہے اور دونوں کی کوششوں کے نتائج میں سرے سے کوئی نسبت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اور یہی صورت حال اس وقت باقی رہے گی جب تک اہلِ حق زبردست قوتوں کو حق کی خدمت میں استعمال کرنے کا ڈھنگ نہ سیکھ جائیں جو آج سو فی صد شیطان کے تصرّف میں ہونے کی وجہ سے یکسر باطل کی خدمت میں صرف ہو رہی ہیں۔

اجتماعی ترقیوں سے استفادہ

دعوت کا طریقہ جس طرح سائنٹیفک نقطۂ نظر سے بہت اعلیٰ اور ترقی یافتہ ہونا چاہیے، تاکہ باطل سے پوری قوّت کے ساتھ مقابلہ ہو سکے۔ اسی طرح معاشرتی اور اجتماعی پہلو سے زندگی میں جو ترقیاں ہو چکی ہیں ان سے بھی اس سلسلہ میں پورا فائدہ اٹھانا چاہیے، تاکہ دعوت وقت کے معیار کے لحاظ سے پوری طرح باوقار ہو۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ سوسائٹی کے اندر آپس میں مل بیٹھنے، باہم دگر تبادلۂ خیالات کرنے، اپنے خیالات کو سنانے اور دوسروں کے خیالات کے سننے، کسی امر کو اجتماعی طور پر طے کرنے کے جو طریقے رواج پا چکے ہیں، اگر ان میں کوئی اخلاقی و شرعی قباحت نہیں ہے، تو اہلِ حق ان کو اپنائیں اور تبلیغِ حق میں ان سے کام لیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے کام میں ان تمام طریقوں سے فائدہ اٹھایا جو اس عہد کی معاشرت اور اجتماعی زندگی میں نشو ونما پا چکے تھے اور دعوت کے نقطۂ نظر سے کارآمد تھے۔ اوّل اوّل جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان کے لیڈروں کو جو در حقیقت قوم کے بھی لیڈر تھے اپنے مقصد سے آگاہ کرنا چاہا تو اس کے لیے طریقہ یہ اختیار فرمایا کہ حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ دعوت کا سامان کریں اور تمام خاندانِ مطلب کو کھانے پر بلائیں۔ حضرت علیؓ نے اس حکم کی تعمیل کی۔ پورا خاندان مُطلب

جمع ہوا۔ حضرت حمزہؓ، حضرت عباسؓ اور ابوطالب، سب لوگ دعوت میں شریک ہوئے۔ جب لوگ کھانا کھا چکے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہوکر ایک تقریر فرمائی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "میں آپ لوگوں کے پاس ایک ایسی چیز لے کر آیا ہوں جو دین و دنیا دونوں کی سعادت کی کفیل ہے"۔ پھر آخر میں حاضرین سے سوال فرمایا کہ "اس بارِ گراں کو اٹھانے میں آپ میں سے کون میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے؟" اس سوال پر سب لوگ خاموش رہے۔ تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد حضرت علیؓ نے ایک گوشہ سے اٹھ کر نہایت مؤثر الفاظ میں فرمایا کہ "گو مجھے آشوبِ چشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی ہیں اور گو میں سب سے نوعمر ہوں تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا"۔

اس طریقہ کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے عام طریقے بھی اختیار فرمائے جو دعوت کے لیے مفید ہو سکتے تھے، مثلاً مکہ اور طائف کے سرداروں سے ملنے اور ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنے کے لیے خود تشریف لے جاتے، حج کے زمانے میں جو قبیلے مکہ کے آس پاس آکر ٹھہر جاتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سرداروں سے ملتے اور ان کو دعوتِ اسلام دیتے، بعض مقامات پر یا بعض خاص خاص لوگوں کے پاس اپنے نمائندے بھی بھیجتے۔ عرب میں کچھ موسمی بازار لگتے تھے جن میں ہر طبقہ کے لوگ جمع ہو جایا کرتے تھے، اور یہ بازار صرف خرید و فروخت اور کھیل تماشوں ہی کے بازار نہ تھے، بلکہ وقت کے معیار کے لحاظ سے ان میں علمی اور ادبی مجلسیں بھی منعقد ہوتی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان بازاروں میں بھی تشریف لے جاتے اور لوگوں کے سامنے دعوت پیش کرنے کے موقعے پیدا کرتے۔ بہت سے لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطوط کے ذریعے سے بھی دعوت دی۔ غرض اس زمانے میں لوگوں کو کسی چیز سے قریب کرنے یا لوگوں سے قریب ہونے کے جو طریقے پیدا ہو چکے تھے، اگر ان میں کوئی اخلاقی خرابی نہیں تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے کام میں ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ہر عہد میں لوگ انہی طریقوں سے مانوس ہوتے ہیں جو اس عہد کی تمدّنی و اجتماعی زندگی میں رواج پا چکے ہوتے

ہیں، اس وجہ سے ضروری ہوتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں انہی طریقوں کو اختیار کیا جائے جو ان کے مزاج اور حالات کے مناسب ہیں۔ جس طرح لوگ ملتے ہیں اسی طرح ان سے ملا جائے، جس طرح لوگ کسی بات کو سنتے ہیں، اسی طرح ان کو سنانے کی کوشش کی جائے، جس طریقِ کار کو لوگ باوقار سمجھتے ہیں اُسی طریق کار کو اختیار کیا جائے۔

اگر ایک داعی ـــــ بالخصوص ایک داعی حق ـــــ ان طریقوں کے اختیار کرنے سے محض اس وجہ سے گریز کرے کہ یہ طریقے اس کے اپنے مذاق کے خلاف ہیں، یا وہ ان کو اختیار کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، یا ان طریقوں پر قدامت کی مہر نہیں لگی ہوئی ہے، اس وجہ سے اس خیال میں وہ معیاری نہیں ہیں، تو ان باتوں کا لازمی نتیجہ اس کی دعوت کی ناکامی کی صورت میں ظاہر ہوگا اور اس کے اخلاصِ نیت کی کوئی بڑی سے بڑی مقدار بھی اس کی دعوت کو اس انجامِ بد سے نہ بچا سکے گی۔ اگر ایک شخص آج دعوت دین کے لیے یورپ اور امریکہ کے کسی ملک میں جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں سے اپنا ربط بڑھانے اور ان کے اندر اپنے خیالات پھیلانے کے وہی ذرائع اور وہی طریقے اختیار کرے جو وہاں کی اجتماعی اور تمدّنی زندگی میں رواج پا چکے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا، یا نہیں کرنا چاہتا، بلکہ مُصر ہے کہ وہ سڑکوں پر چل پھر کر ہی لوگوں کو کلمہ اور نماز سکھائے گا تو خواہ یہ شخص کتنا ہی مخلص ہو، لیکن وہ اپنے اس بے ڈھنگے پن سے اپنی محنت بھی رائگاں کرے گا اور کلمہ اور نماز کی عزّت بھی خاک میں ملائے گا۔

اس سلسلہ میں ایک داعی حق کی احتیاط صرف اس حد تک ہونی چاہیے کہ وقت کے مقبول اور رائج طریقوں میں سے وہ ان طریقوں کو نہ اختیار کرے جن میں اخلاقی پہلو سے کوئی خرابی ہو، اور اگر اس طرح کا کوئی طریقہ کسی خاص ضرورت سے اختیار کرنا ہی پڑ جائے تو ضروری ہے کہ اس کو اس اخلاقی برائی سے پاک کر کے اختیار کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل اوّل اوّل اپنی قوم کو غفلت سے بیدار کرنے اور لوگوں کو اپنی بات کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کوہِ صفا پر چڑھ کر نعرہ لگایا۔ اس کی اصلی شکل عرب جاہلیت

میں یہ تھی کہ خطرہ کی شدّت کا اظہار کرنے کے لیے نعرہ لگانے والا اپنے سارے کپڑے اتار کر بالکل ننگا ہو جایا کرتا تھا۔ چنانچہ عربی میں اس کو 'نذیرِ عریاں' کہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو چوکنا کرنے کا طریقہ تو وہی اختیار فرمایا جو ایک نذیرِ عریاں کا ہوتا تھا، لیکن ننگے ہو جانا، چونکہ ایک سخت قسم کی بے حیائی اور بد اخلاقی تھی، اس وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس برائی سے اس طریقہ کو پاک کر لیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو مجلسی اور اجتماعی طریقے پیدا ہو چکے ہیں ان میں اگر کوئی پہلو برائی کا ہے تو اس برائی کی وجہ سے ان کو یک قلم رد کر دینا ضروری نہیں ہے۔ کرنا صرف یہ چاہیے کہ ان طریقوں کو برائیوں سے پاک کر کے ان کو مقصدِ حق کے لیے استعمال کیا جائے۔

آج متمدّن ملکوں میں کسی تحریک کو لوگوں کے اندر پھیلانے کے جو بے شمار طریقے پیدا ہو چکے ہیں وہ جس طرح برائیوں کو پھیلانے میں کارآمد ہیں، اسی طرح بھلائیوں کو پھیلانے میں بھی نہایت کارآمد ہو سکتے ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ برائیوں سے بچ کر ان سے فائدہ اٹھایا جائے، لیکن مشکل یہ ہے کہ آج جو لوگ ان کو اختیار کرتے ہیں وہ بہتر سے بہتر مقاصد کے لیے بھی ان کو بدتر سے بدتر بنا کر استعمال کرتے ہیں۔ جہاد جیسے مقدّس مقصد کے لیے اگر روپیہ جمع کرنا چاہیں گے تو اس کے لیے مینا بازار لگائیں گے اور اس میں حسن فروشی اور بے حیائی کو جلبِ زر کا ذریعہ بنائیں گے۔ مہاجرین کی امداد جیسے اعلیٰ اور برتر کام کے لیے اگر فنڈ قائم کرنا چاہیں گے تو رقص و سرور اور پیانو نوازی کی مجلیس منعقد کریں گے اور ناچ رنگ اور غمزہ و عشوہ کے ذریعہ سے مسلمانوں کے جذبۂ انفاق کو حرکت میں لائیں گے۔ ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اگر تحریکِ جذبات کے لیے کوئی اور محرّک نہیں ملے گا تو کچھ شعراء حضرات کی خدمات حاصل کر کے انہی کو آمادہ کریں گے کہ کچھ وہی اپنی نغمہ طرازیوں اور مجلس آرائیوں سے دلوں کو گرمائیں اور لوگوں کے ایمان کو بیدار کریں۔ قوم کے فسادِ مذاق کی وجہ سے جن چیزوں کے اندر بھلائی کا کوئی پہلو موجود ہوتا بھی ہے وہ بھی برائی کے سانچہ میں ڈھل جاتی ہیں تو اس بات کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے کہ یہ کسی برائی

کو مٹا کر اس کی جگہ کسی بھلائی کو لائیں گے۔ تاہم اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ جن چیزوں کے اندر کوئی پہلو برائی کا ہے ان کی برائی کی اصلاح کر کے مقصدِ حق کے لیے ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے، ان کو یک قلم نظر انداز کر دینا صحیح نہیں ہے۔

یہ دو اصولی ہدایتیں ان طریقوں سے متعلق ملحوظ رکھنے کی ہیں، جو ایک داعی حق کو اپنی دعوت کے سلسلہ میں اختیار کرنے ہیں۔ اب بعض ہدایتیں ان طریقوں سے متعلق ہم ذکر کریں گے، جن سے بہر حال ایک داعی حق کو احتراز کرنا ہے۔

اس سلسلہ میں اصولی بات یہ ہے کہ داعی کو کوئی ایسا طریقہ نہیں اختیار کرنا چاہیے جو دعوت یا داعی کے وقار یا دعوت کے مفاد کے خلاف ہو۔ ایسی باتیں جو دعوت یا داعی کے وقار یا دعوت کے مفاد کے خلاف ہوں، بہت سی ہو سکتی ہیں۔ ان سب کو گنانا بہت مشکل ہے۔ صرف بعض باتیں ہم بطور مثال ذکر کریں گے، جن سے فی الجملہ اندازہ ہو سکے گا کہ داعیانِ حق کو کس قسم کے طریقوں سے بچنا چاہیے۔

خلافِ وقار طریقوں سے احتراز

ایک داعی حق کو اپنی دعوت کی طرف لوگوں کو مائل کرنے کے لیے ان تمام طریقوں سے بچنا چاہیے جس سے دعوت کی شان یا خود داعی کے وقار کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اپنے کام میں غیر معمولی انہماک اور لوگوں کو حق کی طرف کھینچنے کی زیادہ سے زیادہ خواہش ایک داعی کی بہترین خصوصیت ہے، لیکن اس انہماک اور اس خواہش کو اتنا نہیں بڑھ جانا چاہیے کہ نہ داعی کو اپنے نفس کے حقوق کا کچھ ہوش باقی رہ جائے، نہ اپنے ساتھیوں اور دوستوں کا کچھ خیال باقی رہے اور نہ اپنی دعوت ہی کے مرتبہ مقام ہی کی کچھ ایسی پروا رہ جائے۔ جو سننا نہیں چاہتے ان کو سنانے کے در پے ہونا، بھاگنے والوں کے پیچھے پڑنا، نفرت کرنے والوں کو پرچانا اور گھمنڈ کرنے والوں کی تواضع کرنا بس وہیں تک جائز ہے کہ داعی کی خودداری اور دعوت کی عظمت کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور نہ دعوت کے کام میں کوئی پہلو ابتذال اور اُوچھے

پن کا پیدا ہونے پائے۔ اگر معاملہ اس حد سے آگے بڑھتا نظر آئے تو جس حق کی محبت داعی کو ان تمام نیاز مندیوں پر مجبور کر رہی ہے، اسی حق کے احترام کا تقاضا ہے کہ وہ پوری خودداری کے ساتھ ایسے لوگوں سے الگ ہو جائے اور صرف ان لوگوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے جن میں حق کی طلب اور علم کی پیاس موجود ہے۔ سورۂ عبس کی مندرجہ ذیل آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے لیڈروں کے ساتھ اسی طرح کی نیاز مندی سے روکا گیا ہے اور اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس بلند رتبہ دعوت کو لے کر تم اٹھے ہو وہ ایسے نہیں ہے کہ اس کو اس قدر جھک کر پیش کیا جائے۔ ان آیات میں قرآن کی عظمت اور اس کے مرتبہ کی بلندی کا ذکر اسی مقصد سے کیا گیا ہے کہ یہ بلند مرتبہ کلام جس کے آگے پیش کیا جائے اس کو پیش کرتے وقت اس کے مرتبہ کا لحاظ رہے کہ یہ خدا کا فرمان ہے، کسی سائل کی درخواست نہیں ہے:

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ﴿۵﴾ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ﴿۶﴾ وَ مَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰی ﴿۷﴾
وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰی ﴿۸﴾ وَ هُوَ يَخْشٰی ﴿۹﴾ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی ﴿۱۰﴾
كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿۱۱﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۱۲﴾ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾
مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿۱۴﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾

(عبس ۸۰:۵-۱۶)

"جو بے پروائی برتتا ہے اس کے تو تم پیچھے پڑتے ہو، حالانکہ تم پر کوئی ذمہ داری نہیں اگر وہ اپنی اصلاح نہ کرے اور جو تمہارے پاس شوق سے آتا ہے اور وہ خدا سے ڈرتا بھی ہے تو تم اس سے بے پراوئی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک یاددہانی ہے تو جو چاہے یاددہانی حاصل کرے۔ لائق تعظیم، بلند اور پاکیزہ صحیفوں میں، معزز باوفا کاتبوں کے ہاتھوں میں۔"

تبلیغ کے جوش میں یہ بات جائز نہیں ہے کہ آدمی جس مجلس میں چاہے جا دھمکے اور کوئی متوجہ ہو یا نہ ہو، لیکن وہ اپنی بات سنائے بغیر نہ ٹلے اور نہ یہ بات جائز ہے کہ چمٹنے والے گداؤں کی طرح جو راہ گیر مل جائے اس کے پیچھے پڑ جائے اور جب تک اس کو کچھ سنا نہ

لے یا اس سے کچھ سن نہ لے اس وقت تک اس کا پیچھا نہ چھوڑے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ:

ولا الفینک تاتی القوم وھم فی حدیث من حدیثھم فتقصّ علیھم فتقطع علیھم حدیثھم فتملّھم ولکن انصت فاذا امروک فحدثھم وھم یشتھونہ۔ [1]

"میں تمہیں اس حال میں نہ دیکھوں کہ تم کسی جماعت کے پاس جاؤ اور وہ اپنے کسی اور کام میں مشغول ہوں اور تم ان کی بات کاٹ کر ان کو اپنا وعظ سنانا شروع کر دو اور وہ اکتاہٹ محسوس کرنے لگیں بلکہ تمہیں چاہیے کہ تم خاموش رہو اور جب لوگ فرمائش کریں تو ان کو سناؤ اور وہ خواہش سے سنیں۔"

کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنے سے سخت احتراز کرنا چاہیے جس سے دعوت لوگوں پر بوجھ بن جائے، اور وہ اس سے گھبرانے لگ جائیں:

عن ابی وائل قال: کان عبد اللّٰہ ابن مسعود یذکّر النّاس فی کل خمیس۔ فقال لہ رجل: یا اباعبد الرحمن! لودوتُّ انّک ذکّرتنا کل یوم۔ قال: امّا انہ یمنعنی من ذٰلک انّی اکرہ اَن اُمِلّکم وانی اتخوّلکم بالموعظۃ کما کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یتخوّلنا بھا مخافۃ السّامۃ علینا۔ [2]

"ابووائل سے روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ لوگوں کو ہر جمعرات کو وعظ سنایا کرتے تھے۔ ایک شخص نے اُن سے کہا کہ اے ابوعبدالرحمٰن! میری خواہش ہے کہ آپ روزانہ وعظ کہا کریں۔ انہوں نے کہا کہ میں ایسا اس وجہ سے نہیں کرتا کہ کہیں تم پر بوجھ نہ بن جاؤں۔ میں بھی اسی طرح ناغہ کر کے تمہیں نصیحت سناتا ہوں جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو ناغہ کر کے نصیحت سنایا کرتے تھے کہ ہم بیزار نہ ہو جائیں۔"

---

[1] صحیح بخاری: کتاب الدعوات، باب ۲۰

[2] صحیح البخاری: کتاب العلم، باب من جعل لا ھل العلم ایّاما معلومۃ۔

مخالف مقصد طریقوں سے احتراز

داعی حق کو کبھی کوئی طریقہ ایسا نہیں اختیار کرنا چاہیے جو اپنی فطرت کے لحاظ سے دعوت کے مقصد کے بالکل منافی ہو، مثلاً مناظرہ کا طریقہ۔ یہ طریقہ اگرچہ ایک مدّت سے دعوت وتبلیغ کا سب سے زیادہ کارگر طریقہ خیال کیا جاتا ہے اور اس کی اسی اہمیّت سے ہمارے اہلِ فن نے اس پر کتابیں بھی لکھ ڈالی ہیں، جو عربی مدرسوں میں بھی پڑھائی جاتی ہیں، لیکن دعوتِ حق کی روح سے جس قدر بعید طریقہ یہ ہے اس قدر بعید کوئی اور طریقہ ہو نہیں سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مجادلہ اور محاجّہ کی اجازت دی ہے، لیکن ان لفظوں کا مفہوم یہ مناظرہ سمجھ لینا جس کی تعلیم ہماری دینی درس گاہوں میں دی جاتی ہے اور جس کے اکھاڑے آئے دن ہمارے مبلّغین اور مناظرین جماتے رہتے ہیں، بالکل غلط ہے۔ چونکہ ہمارے اہلِ مناظرہ کا زیادہ تر استدلال قرآن مجید کے انہی دو لفظوں سے ہے، اس وجہ سے ہم مختصراً ان دو لفظوں کا مفہوم قرآن سے واضح کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ انبیاء کے مُجادلہ اور مُحاجّہ اور مروّجہ مناظرہ کا فرق واضح ہو سکے۔

قرآن نے کس مُجادلہ کی اجازت دی ہے

قرآن مجید میں دو طرح کے مُجادلہ کا ذکر آتا ہے: ایک مُجادلۂ باطل، دوسرا مُجادلۂ حَسن۔ مُجادلۂ باطل کو قرآن نے کفّار اور معاندین کی طرف منسوب کیا ہے اور اس کی خصوصیات تقریباً وہی بیان کی ہیں جو عام طور پر اس زمانہ کے مناظروں میں پائی جاتی ہیں۔ وہی اپنی بات پر بلا کسی دلیل معقول کے اصرار، وہی غیر متعلق باتوں میں اصل مسئلہ کو الجھانے کی خواہش، وہی بے فائدہ کج بحثیوں میں تضییعِ وقت، وہی اپنے حریف کی بات کو نہ خود سننا نہ کسی کو سننے دینا، وہی لایعنی موشگافیاں اور بے نتیجہ زبان درازیاں جو عام طور پر اس زمانہ کے مناظروں کی خصوصیات میں شامل ہیں۔ قرآن مجید نے بھی مجادلۂ باطل کی

یہی خصوصیات بتائی ہیں اور اہلِ حق کو نہایت سختی کے ساتھ اُن سے روکا ہے اور صرف احسن طریقہ سے مُجادلہ کی اجازت دی ہے اور اس احسن طریقہ کی وضاحت علمی اور عملی، دونوں پہلوؤں سے خود کر دی ہے تا کہ اس کو ہر شخص اچھی طرح سمجھ جائے۔

اس کا علمی طریقہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ مخاطب سے لڑائی کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کی جائے کہ جن اصولوں میں اس کے ساتھ اشتراک واتحاد ہے، اور جن کو تسلیم کرنے سے اس کو انکار نہیں ہے ان کو اس کے سامنے واضح کیا جائے تا کہ وہ داعی کی بات سننے کی طرف راغب ہو اور پھر اس کے سامنے ان نتائج کو رکھا جائے جو اس کے اپنے اقرار کردہ اصولوں سے لازمی طور پر نکلتے ہیں تا کہ وہ ان کو اپنی بات سمجھ کر قبول کرنے کی طرف مائل ہو۔ اپنے حریف کا دعویٰ سمجھ کر اس کی تردید کا جذبہ اس کے اندر نہ پیدا ہو۔ اس کی نہایت عمدہ مثال بھی خود قرآن نے پیش کر دی ہے:

وَ لَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ اِلٰهُنَا وَ اِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (العنکبوت ۲۹:۴۶)

"اور اہلِ کتاب سے نہ بحث کرو مگر اس طریقہ پر جو بہتر ہے بجز ان کے جو ان میں سے ظالم ہیں اور کہو کہ ہم ایمان لائے اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف اتاری گئی اور ہمارا تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔"

اس آیت میں پہلے تو یہ بات واضح کر دی کہ جو شریر اور مفسد لوگ ہیں، جو صرف جھگڑنا چاہتے ہیں اور حق کو سمجھنے اور ماننے کا کوئی جذبہ اپنے اندر نہیں رکھتے ہیں، ان کو سرے سے منہ ہی نہ لگایا جائے۔ البتہ جو حق کے طالب ہیں ان سے گفتگو کی جائے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ آغازِ گفتگو ان اصولوں سے کیا جائے جو ہمارے اور ان کے درمیان مسلّم ہیں۔

اسی اصول کے مطابق اہلِ کتاب کے ساتھ توحید کی دعوت ایسے الفاظ میں پیش کی گئی ہے جس سے واضح ہو رہا ہے کہ جب اہلِ ایمان اور اہلِ کتاب میں توحید ایک بنیادی اصول

کی حیثیت سے مسلّم ہے تو پھر اس کے نتائج اور مقتضیات میں باہم اختلاف کیوں ہو۔ جب اہل کتاب نے اس اصل کو مان رکھا ہے تو چاہیے کہ ان لازمی نتائج کو بھی تسلیم کریں جو اس سے نکلتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾

(آل عمران ۳: ۶۴)

"کہہ دو: اے اہلِ کتاب! اس چیز کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیاں یکساں مشترک ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائے۔ اگر وہ اس چیز سے اعراض کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں۔"

قرآن نے مجادلہ کی عملی مثالیں جو نقل کی ہیں اور جن کی تعریف فرمائی ہے ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مُجادلہ درحقیقت نام ہے اس بات کا کہ اپنی بات منوانے کے لیے مخاطب پر محبت، اعتماد، حسنِ اخلاق اور حسنِ استدلال سے گھیرے ڈالے جائیں۔ یہاں تک کہ وہ داعی کی دل سوزی، اس کی بے لوثی اور اس کے اخلاص سے متاثر ہو کر اس کی بات کی صداقت پر غور کرنے اور اس کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ قرآن نے اس طرح کے متعدد مجادلے نقل کیے ہیں، جن کی تفصیل میں طوالت ہے۔ ہم صرف ایک مجادلہ بطورِ مثال ذکر کریں گے تا کہ یہ واضح ہو سکے کہ کس طرح کے پُر محبت اصرار اظہار کو مُجادلہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور اس کی تعریف کی گئی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قومِ لوط کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے جو مُجادلہ کیا ہے قرآن نے اس کی تعریف فرمائی ہے، تفصیلی صورت کیا تھی۔ قرآن مجید میں صرف اس کی تعریف کی گئی ہے اس کی کوئی تفصیل نہیں دی گئی ہے اس وجہ سے ہم اس کی تفصیل تورات سے لے رہے ہیں۔ تورات کے بیان کے مطابق

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان فرشتوں سے جو قومِ لوط کے لیے عذاب لے کر آئے تھے۔ مندرجہ ذیل گفتگو فرمائی:

''تب ابراہام نے نزدیک جا کر کہا: کیا تُو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا؟ شاید اس شہر میں پچاس راست باز ہوں۔ کیا تو اسے ہلاک کرے گا اور ان پچاس راست بازوں کی خاطر جو اس میں ہوں اس مقام کو نہ چھوڑے گا؟ ایسا کرنا تجھ سے بعید ہے کہ نیک کو بد کے ساتھ مار ڈالے اور نیک، بد کے برابر ہو جائیں۔ یہ تجھ سے بعید ہے۔ کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا؟ اور خداوند نے فرمایا کہ اگر مجھے سدُوم میں شہر کے اندر پچاس راست باز ملیں تو میں ان کی خاطر اس مقام کو چھوڑ دوں گا۔ تب ابراہام نے جواب دیا اور کہا کہ دیکھیئے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی اگرچہ میں خاک اور راکھ ہوں۔ شاید پچاس راست بازوں میں پانچ کم ہوں۔ کیا ان پانچ کی کمی کے سبب سے تو تمام شہر کو نیست کرے گا؟ اس نے کہا: اگر مجھے وہاں پینتالیس ملیں تو میں اسے نیست نہیں کروں گا۔ پھر اس نے اس سے کہا: شاید وہاں چالیس ملیں۔ تب اس نے کہا: میں ان چالیس کی خاطر بھی یہ نہیں کروں گا۔ پھر اس نے کہا: خداوند ناراض نہ ہو تو میں کچھ اور عرض کروں۔ شاید وہاں تیس ملیں۔ اس نے کہا: اگر مجھے وہاں تیس بھی ملیں تو بھی ایسا نہیں کروں گا۔ پھر اس نے کہا: دیکھیے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی۔ شاید وہاں بیس ملیں۔ اس نے کہا: میں بیس کی خاطر بھی اسے نیست نہیں کروں گا۔ تب اس نے کہا: اگر خداوند ناراض نہ ہو تو میں ایک بار اور کچھ عرض کروں۔ شاید وہاں دس ملیں۔ اس نے کہا: میں دس کی خاطر بھی اسے نیست نہیں کروں گا۔ جب خداوند ابرہام سے باتیں کر چکا تو چلا گیا اور ابراہام اپنے مکان کو لوٹا''۔[1]

یہ طرزِ کلام، یہ طرزِ تخاطب، یہ طرز استدلال اور پرمحبت اصرار کا یہ انداز ہے جس کو قرآن نے مُجادلہ سے تعبیر کیا ہے —— اور یہ مُجادلہ ہے جس کی قرآن حکیم نے تعریف فرمائی ہے۔ اگر لوگ اسی مُجادلہ کو اپنے مناظروں کے جواز کی دلیل ٹھہراتے ہیں تو چاہیے کہ جو روح اس مُجادلہ کے اندر ہے وہی روح اپنے مناظروں کے اندر پیدا کریں اور اسی دل

---

[1] پیدائش۔ باب ۱۸: ۲۳-۳۳

سوزی و دردمندی کے ساتھ اپنی بات مخاطب کے سامنے پیش کریں، نہ کہ سارا اہتمام تو رزم و پیکار اور جنگ و قتال کا ہو اور نام اس کا رکھ لیا جائے۔ مناظرہ اور اس کے جواز کی دلیل لائی جائے انبیاء کی زندگی سے۔

اسی طرح قرآن مجید نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک اور مناظرہ بھی نقل کیا ہے، جس کو محاجّہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ مناظرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے زمانہ کے ایک بادشاہ کے درمیان ہوا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بادشاہ سے فرمایا کہ ''میرا رب وہ ہے جو مارتا اور جلاتا ہے''۔ اس کے جواب میں بادشاہ نے کہا کہ ''میں مارتا اور جلاتا ہوں''۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ ''میرا پروردگار سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اس کو مغرب سے نکال!'' اس مناظرہ کو اگر موجودہ فنِ مناظرہ کے ان اصولوں پر پرکھا جائے جن کی تعلیم ہماری مناظرہ کی کتابوں میں دی جاتی ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کچھ اچھے مناظر ثابت نہ ہوں گے۔ کیونکہ وہ بادشاہ کے اس قول پر کہ ''میں مارتا ہوں اور جلاتا ہوں'' بہت کچھ معارضہ کر سکتے تھے جو انہوں نے نہیں کیا۔ حالانکہ ایک مناظر کی حیثیت سے یہی مقام ان کے مورچہ لگانے کا تھا، لیکن انہوں نے ایک مناظر کے اصولِ جنگ کے بالکل خلاف اس نقطہ سے ازخود پسپائی اختیار کی اور جونہی محسوس فرمایا کہ یہ شخص مناظرہ اور اپنی بات کی پچ کرنے پر تل گیا ہے وہ ایک مُسکِت بات کہہ کر فوراً علیحدہ ہو گئے۔ جس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اگر داعی حق کو مخاطب کے متعلق یہ اندازہ ہو جائے کہ یہ بات کو سننا اور سمجھنا نہیں چاہتا، بلکہ معارضہ اور مناظرہ پر اتر آیا ہے تو اس کے درپے نہیں ہونا چاہیے، بلکہ گفتگو کو ختم کر دینا چاہیے۔

باب ۷

دعوت کی زبان
اور
داعیانِ حق کا طرزِ کلام

اب ہم بعض باتیں دعوت کی زبان اور انبیاء کے طرزِ کلام سے متعلق بیان کریں گے۔ ایک داعی کا مقصد مجرد ایک حقیقت کو ظاہر کر دینا ہی نہیں ہوتا، بلکہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حقیقت پوری طرح آشکارا ہو جائے تاکہ خواص بھی اس کو اچھی طرح سمجھ لیں اور عوام کے لیے بھی اس کے سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہ رہ جائے۔ نیز یہ کہ وہ حقیقت نہایت خوب صورت طریق پر ظاہر ہو تاکہ سننے والوں میں سے جن کے دلوں میں قبول حق کی کچھ بھی صلاحیت ہے وہ اس کو قبول کر لیں اور اعراض کرنے والوں کے اعراض کے لیے ان کی بدذوقی اور ہٹ دھرمی کے سوا اور کوئی وجہ باقی نہ رہ جائے۔ اس مقصد کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ دعوت کی زبان مؤثر اور داعی کا طرزِ کلام فطری اور دل نشین ہو۔ لیکن تاثیر اور کشش پیدا کرنے کے بہت سے مصنوعی اور غیر فطری طریقے بھی ہیں۔ جن سے کلام میں ایک ظاہری کشش اور دل فریبی پیدا کی جا سکتی ہے۔ مثلاً عرب جاہلیّت میں کاہن لوگ سجع آرائی اور قافیہ پیمائی سے اپنے کلام میں شان پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ خطباء اپنی لفاظی اور آتش بیانی سے اپنے کلام کے زور و اثر کو بڑھاتے تھے، شعراء اپنی مبالغہ آرائی اور رندی و ہوس ناکی کی دعوت سے لوگوں کو وجد میں لاتے تھے۔ اسی طرح اس زمانہ میں واعظ اور خطیب شعروں

اور قصّوں کی مدد سے اپنے کلام میں تاثیر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اخبار نویس اور مقررین سیاسی جھوٹ اور مبالغہ سے اپنی دکان چلاتے ہیں، اشتہاری دوا فروش جھوٹی قسموں سے اپنا اعتبار بڑھاتے ہیں۔ ان چیزوں سے کلام میں ایک اثر تو ضرور پیدا ہو جایا کرتا ہے، لیکن ان کی حقیقت جھوٹے ملمّع سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے جو لوگ دنیا میں حق کی دعوت کے لیے اٹھتے ہیں نہ تو یہ بات ان کے شایانِ شان ہے کہ ان مزخرف چیزوں سے اپنی دعوت کی رونق بڑھائیں اور نہ وہ اپنی زبان اور اپنے کلام کو ان چیزوں میں سے کسی چیز سے آلودہ ہی کرتے ہیں۔ ان جھوٹی اور نمائشی چیزوں کی جگہ وہ اس مقصد کے لیے دوسری چیزیں اختیار کرتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ جائز اور صحیح ہیں، بلکہ فطرتِ انسانی کے ساتھ وہ گہری مناسبت بھی رکھتی ہیں۔ اس وجہ سے ان سے جو اثر پیدا ہوتا ہے وہ جھوٹے ملمعوں کی طرح ایک ہی رگڑ میں اڑ نہیں جایا کرتا، بلکہ امتحان کی بھٹیوں میں تپنے کے بعد اس کا جوہر اور زیادہ نکھر کے سامنے آتا ہے۔

داعی کے کام کی نوعیّت

یہ بات کہ دعوت کا کام صرف اس طرز کے کلام سے نہیں چل سکتا جو علمی اور مجلسی قسم کی بحثوں کے لیے موزوں ہے، اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک داعی کا کام واقعات کی روایات کرنے والے مؤرخ، قانون کی دفعات مرتب کرنے والے مقنّن اور فلسفہ و ریاضی کے مسائل بیان کرنے والے ایک فلسفی اور ماہرِ ریاضیات سے بالکل مختلف ہے۔ ایک طرف تو اس کا موضوع اتنا وسیع ہوتا ہے کہ ساری انسانی زندگی اس کے تحت آ جاتی ہے، دوسری طرف اس کے مخاطب طبیعت و مزاج کے لحاظ سے بھی مختلف ہوتے ہیں اور ذہن و ادراک کے اعتبار سے بھی متفاوت ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اپنے مشن کے ساتھ اس کا لگاؤ بھی اس طرح کا نہیں ہوا کرتا جس طرح کا لگاؤ ایک مجلسی مضمون نگار کو اپنے مضمون کے ساتھ یا ایک وکیل کو اپنے مقدمہ کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ بلکہ وہ اس

کے لیے زندگی اور موت کا سودا کرتا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے اسے جی جان کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ ایسی حالت میں نہ تو وہ اتنی بات پر قانع ہی ہوسکتا کہ جو بات اسے کہنی ہے، کسی نہ کسی طرح ایک مرتبہ کہہ ڈالے، اور نہ اتنے سے اس کا کام ہی بن سکتا۔ بلکہ لازماً اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ جس بات کو بھی کہے ایسی وضاحت وخوبی کے ساتھ کہے کہ اس کا کوئی پہلو بھی گنجلک نہ رہ جائے اور ایسے مؤثر اور دل نشین انداز میں پیش کرے کہ جس دل کے اندر سماعتِ حق کی ادنیٰ صلاحیت بھی ہو اس میں گھر کر جائے۔ چنانچہ اسی جذبہ کے ماتحت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائی:

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿٢٥﴾ وَ يَسِّرْ لِيْۤ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿٢٨﴾ (طٰہٰ ٢٠:٢٥-٢٨)

"اے میرے رب! میرے سینے کو میرے لیے کھول دے، اور میری مہم (یعنی دعوتِ حق) کو آسان کر اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات سمجھیں۔"

نیز حضرت ہارون علیہ السلام کے لیے دعا فرمائی کہ ان کو میرے اس کام میں شریک کر دے۔ تاکہ ان کی زبان آوری میرے نقصِ گویائی کی تلافی کر سکے اور یہ دعوت کا کام جو میرے سپرد کیا گیا ہے ناتمام نہ رہ جائے۔

داعیانِ حق کے کلام کی خصوصیات

اب ہم بالاختصار ان چیزوں کی طرف اشارہ کریں گے جو انبیاء اور حق کے داعیوں کے کلام کی خصوصیات میں سے ہیں اور جن کو ان کے کلام کی تاثیر میں، ان کی اعلیٰ سیرت اور پاکیزہ تعلیم کے سوا، ہر چیز سے زیادہ دخل ہے اور جن سے کوئی داعی حق بھی کسی زمانہ میں مستغنی نہیں ہوسکتا۔

پہلی خصوصیّت

سب سے پہلی چیز جو ہمیشہ انبیاء اور حق کے داعیوں کی خصوصیات میں سے رہی ہے، یہ ہے کہ انہوں نے جس قوم کو دعوت دی ہے، اسی کی زبان میں دعوت دی ہے، تاکہ قوم کے ہر گروہ اور ہر طبقے پر اللہ کی حجّت پوری ہوسکے:

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ

(ابراہیم ۱۴:۴)

"اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تا کہ وہ ان پر اچھی طرح واضح کردے۔"

جس طرح یہ بات بالکل فطری اور معقول معلوم ہوتی ہے کہ ہر داعی حق کی دعوت کا اصل میدان اس کی اپنی قوم کے اندر ہونا چاہیے اور قوم کو گمراہی میں چھوڑ کر اس کے لیے یہ بات زیبا نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو کلمہ نصیحت سنانے کے لیے خشکی و تری کا سفر کرے، اسی طرح یہ بات بھی فطری اور معقول معلوم ہوتی ہے کہ ہر داعی حق کو اپنی قوم ہی کی زبان کو اس کے اندر دعوت کا ذریعہ بنانا چاہیے جو لوگ ان باتوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ اصلی حق داروں کی بھی حق تلفی کرتے ہیں اور اپنی صلاحیّت کار کو بھی برباد کرتے ہیں اور ان دونوں باتوں کے لیے وہ عنداللہ جواب دہ ہوں گے۔ ہر آدمی جس قوم کے اندر پیدا ہوتا ہے اس قوم کے اندر جس خوبی کے ساتھ وہ کام کرسکتا ہے کسی دوسری قوم کے اندر اس خوبی کے ساتھ نہیں کرسکتا، اور اپنی قوم ہی کی زبان میں اس کی دعوت جتنی مؤثر ہوسکتی ہے کسی اور زبان میں نہیں ہوسکتی۔ اس وجہ سے ہر داعی حق کے لیے صحیح طریق کار یہی ہے کہ وہ اپنی قوم کی زبان کو اپنی دعوت و تبلیغ کا ذریعہ بنائے اور اس بات کی ہرگز پروانہ کرے کہ کوئی دوسری زبان اس کی اپنی زبان سے زیادہ ترقی یافتہ اور وسیع ہے اور اس میں تقریر کرنا یا مضمون لکھنا زیادہ وسیع حلقہ تک اپنے خیالات کو پہنچانے اور زیادہ عزّت و شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ

ہے۔ ایک داعی حق کے پیشِ نظر اوّلین شے یہ نہیں ہونی چاہیے کہ جو دعوت وہ لے کر اٹھا ہے اس کے زیادہ سے زیادہ کانوں تک پہنچ جانے کا ذریعہ کیا ہوسکتا ہے۔ بلکہ اسے سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ جن لوگوں کی ہدایت و خدمت پر وہ خدا اور فطرت کی طرف سے مامور ہے ان کے دلوں میں گھسنے کا سب سے زیادہ مؤثر اور قریبی ذریعہ کیا ہے۔ اگر وہ ذریعہ تنگ اور محدود ہو اور اس کے اختیار کرنے سے اس کی شہرت اور شخصیت کو نقصان پہنچ رہا ہو تو بھی اس کو اس بات کی پروا نہیں کرنی چاہیے، بلکہ اسی کو اختیار کرنا چاہیے، کیونکہ جو مقصد اس کے پیشِ نظر ہے اس کے حاصل ہونے کا ذریعہ وہی ہے۔ جس دہقان کی جھولی میں صرف چند بیج ہیں اور ان کو بہر حال وہ اپنے چھوٹے سے کھیت ہی میں بونا چاہتا ہے، اسے ان لوگوں پر رشک نہیں کرنا چاہیے جو نہایت وسیع رقبوں میں تخم ریزی کر رہے ہیں، بلکہ جو رقبہ اس کے حصے میں آیا ہے اپنی ساری توجہ اسی پر مرکوز کرنی چاہیے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ "میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا ....لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو ڈال دینا اچھا نہیں"۔[1]

حضرت مسیح علیہ السلام کے اس قول پر، بعضوں نے نافہمی سے اعتراضات کیے ہیں اور ان پر العیاذ باللہ، تنگ نظری کا الزام لگایا ہے، حالانکہ انہوں نے جو بات فرمائی ہے بالکل حقیقت ہے۔ ہر آدمی کے کام کرنے کا ایک فطری دائرہ ہے اور وہ صحیح اور نتیجہ بخش کام اسی وقت تک کرسکتا ہے جب تک اپنی جدّ وجُہد کو اس دائرہ کے اندر محدود رکھے۔ اگر وہ اس سے بڑھ کر ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کرتا ہے تو گو وہ اس مغالطہ میں مبتلا ہوتا ہے کہ اب اس کی جدّ وجہد کا میدان پہلے کی نسبت زیادہ وسیع ہوگیا ہے، لیکن حقیقت میں وہ اپنی قوّت ضائع کر رہا ہوتا ہے۔

---

[1] انجیل متی- باب ۱۵ :۲۴، ۲۶

دوسری خصوصیّت

انبیاء اور داعیوں کے کلام کی دوسری خصوصیّت یہ ہے کہ ان کا کلام، کلامِ مُبین ہوتا ہے۔ کلامِ مُبین کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کی اس بولی میں گفتگو کرتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ خوبی اور صفائی کے ساتھ حرفِ مدّعا کو قوم کے ہر حلقہ تک پہنچا سکے۔ اس میں نہ اجمال و ابہام ہوتا ہے، نہ غیر ضروری طوالت، نہ استعارات وتشبیہات کی کثرت ہوتی ہے، نہ عقل آزما تلمیحات کی زیادتی، نہ ثقیل اور غیر مانوس الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے، نہ رکاکت اور ابتذال کا کوئی شائبہ، دُھلی ہوئی زبان، بے تکلّف استعارے، حقیقت کو مجاز کے بھیس میں دکھا دینے والی تشبیہیں اور تمثلیں۔ علاوہ ازیں غصہ کے بجائے دل سوزی، سختی کے بجائے نرمی، اور آرائشِ بیان کے بجائے سادگی اور صفائی۔ وہ اپنے وقت کی مختلف طرزوں (سٹائل) میں سے اس طرز کو اختیار کرتے ہیں جو وقار، اثر انگیزی اور وضاحتِ مقصد کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور اعلیٰ ہوتی ہے۔ پھر اپنے نفس کی بلندی، اپنے ولولۂ دعوت کی گرمی و دل سوزی اور اپنے علم کی یقین آفرینی اور ایمان بخشی اور سب سے زیادہ اپنے مدّعا کو سمجھانے کی گہری خواہش سے اس کو اس قدر ترقی دے دیتے ہیں کہ ان کا اپنا ایک نیا سٹائل پیدا ہو جاتا ہے جو خود نمونہ اور مثال کا کام دینے لگتا ہے۔ اس سٹائل کی اصلی خصوصیّت اس کی دل نشینی اور افہام کی صلاحیّت ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس کی روانی اور سادگی کی وجہ سے اس میں ایسی ادبی خوبی بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کے آگے بڑے بڑے ادیبوں کے کلام بالکل بے جان معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس کے لفظ لفظ سے رس ٹپکتا ہے اور فقرہ فقرہ سے روح کو غذا ملتی ہے۔ اس کی تاثیر سے نہ صرف افراد کی بلکہ قوموں کی زندگیاں بدل جایا کرتی ہیں اور ایک داعی حق کے ہاتھ میں یہ وہ طاقت ہے جس کا مسلّح فوجیں بھی مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء نے، جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے، اس کے لیے دعائیں کی ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں دعوتِ دین کی اس مظلومیّت پر ترس آتا ہے کہ

یہاں جو حضرات اس فرض کو انجام دے سکتے تھے یعنی علمائے دین وہ ہمیشہ اپنی کج مج بیانی کے لیے بدنام رہے ہیں۔ اوّلاً تو یہ حضرات اس زبان میں لکھنے اور بولنے ہی کو کسرِ شان سمجھتے رہے ہیں جس زبان کو یہاں ''لسانِ قوم'' کی حیثیت حاصل تھی۔ ثانیاً اگر اس میں انہوں نے لکھنا اور بولنا شروع بھی کیا تو ان کی ایک خاص زبان بن گئی؛ جو اپنی ثقالت، اپنی خشکی اور اپنی غیر ضروری طوالت یا اپنے مانع فہم اختصار کے لیے مشہور ہے۔ یہاں تک کہ کسی کتاب سے لوگوں کو بدگمان کر دینے کے لیے یہ فقرہ بالکل کافی ہوتا ہے کہ اس کا طرزِ تحریر بالکل ''مولویانہ'' ہے۔ یہ صورت حال بجائے خود نہایت رنجدہ تھی، لیکن مزید ستم یہ ہوا کہ یہ حضرات تو اپنی ''ثقل زبانی'' کے لیے بدنام رہے اور جو گروہ مذہب سے بے تعلّق یا اس کا مخالف تھا اس نے قوم کی زبان پر قبضہ کرلیا اور اب تک بظاہر اسی کا قبضہ چلا آرہا ہے۔

تیسری خصوصیّت

انبیاء اور حق کے داعیوں کے کلام کی تیسری خصوصیّت یہ ہے کہ وہ اپنے ایک مقصد کی طرف ہزار راہوں سے آتے ہیں۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں اس چیز کو تصریفِ آیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ایک مدّعا کو مختلف اسلوبوں اور پہلوؤں سے سمجھانے کی کوشش کرنا۔ میر انیس کے الفاظ میں ع

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

داعی کے کلام میں یہ گونا گونی اس کے اصل مقصد یعنی افہام اور اتمامِ حجّت کے لحاظ سے ضروری ہے۔ جو بات ایک پہلو سے سمجھ میں نہیں آتی وہی بات جب دوسرے پہلو سے سامنے آتی ہے تو اس طرح دل میں اتر جاتی ہے گویا ہمارے ہی دل کی بات تھی۔ آدمیوں کے مذاق اور رجحانِ طبیعت کی طرح ان کے دماغ کے کینڈے بھی مختلف ہوا کرتے ہیں اور حالات کے اختلاف سے ان کے رخ بدلتے بھی رہتے ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ جو شخص ان کے دل میں کوئی بات، مسلکِ زندگی کی حیثیت سے اتارنے کا درد رکھتا ہو وہ ان

کے کینڈے کے اختلاف اور رخ کی تبدیلی کے لحاظ سے مختلف سمتوں سے ان کے پاس آئے۔ اگر ایک ہی راہ سے اور ایک ہی رنگ میں آئے گا، تو ایک داعی کی حیثیت سے وہ اپنے مقصد میں بالکل ناکام رہے گا۔ کیونکہ اس کی یہ یک رنگی اس فطرت کے بالکل خلاف ہے جو اپنے ہر گوشہ میں تنوّع پسند اور رنگا رنگ واقع ہوئی ہے۔ جو لوگ داعی کے فرض کی نوعیّت اور انسانی فطرت کے ان احوال سے واقف نہیں ہیں ان کے سامنے جب داعیانہ کلام آتا ہے تو وہ اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں کہ اس میں غیر ضروری طوالت ہے، اس میں ایک ہی بات کی تکرار ہے، یہ تھکا دینے والا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ وہ اس بات پر نہیں غور کرتے کہ ایک داعی کا کام ایک اکیڈمک طرز کے مضمون نگار سے بالکل مختلف ہوا کرتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر صرف چند یک رنگ آدمیوں کے سامنے ہی اپنے خیال کو ظاہر کرنا ہوتا ہے اور اس بے چارے کو مختلف المزاج، مختلف الفطرت اور مختلف الاستعداد دلوں کے اندر اپنی بات اتارنے کے لیے جتن کرنا پڑتا ہے۔ اس کی کامیابی کے لیے یہ بس ہے کہ اس نے اپنا مافی الضّمیر ایک خوب صورت اسلوب سے ادا کر دیا اور اس کی کامیابی کے لیے یہ شرط ہے کہ دوست دشمن، سب پکار اٹھیں کہ تو نے پہنچانے کا حق ادا کر دیا:

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۝ (الانعام ۶: ۱۰۵)

”اور اسی طرح ہم اپنی دلیلیں مختلف اسلوبوں سے پیش کرتے ہیں تاکہ ان پر حجّت قائم ہو اور تاکہ وہ بول اٹھیں کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کر سنا دیا اور تاکہ ہم اس کو اچھی طرح واضح کر دیں ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔“

چوتھی خصوصیّت

داعیانِ حق کے کلام کی چوتھی خصوصیّت یہ ہے کہ جس طرح وہ حجّت و استدلال سے معلوم ہوتا ہے اسی طرح جوش اور جذبہ سے بھی لبریز ہوتا ہے۔ وہ خشک فلسفیوں کی طرح

صرف عقل ہی کو خطاب نہیں کرتے، بلکہ انسان کے اعلیٰ جذبات سے بھی اپیل کرتے ہیں۔ جذبات سے اپیل کرنا کوئی برائی نہیں ہے۔ برائی اگر ہے تو انسان کے حیوانی جذبات سے اپیل کرنا ہے، جس سے اہلِ حق ہمیشہ احتراز کرتے رہے ہیں۔ انسان کے اندر اصلی محرک طاقت عقل نہیں ہے، بلکہ جذبات ہیں۔ اس وجہ سے کوئی داعی، جو زندگی کے نظام میں کسی تبدیلی کی دعوت لے کر اٹھا ہو یا پورے نظامِ زندگی کو ڈھا کر اس کو از سرِ نو نئی بنیادوں پر قائم کرنا چاہتا ہو، بغیر جذبات کو ابھارے اپنے مقصد کی راہ میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ جو حضرات اپنی علمی تحقیقات کے نوادر و لطائف بیان کر کے دوسروں کو محظوظ کر دینے اور اپنا جی خوش کر لینے کو مقصودِ زندگی بنائے ہوئے ہوں وہ اس داعیانہ رنگ کو ''مدّعیانہ'' رنگ خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ ایک داعی کے کلام میں جو جوش و جذبہ پایا جاتا ہے وہ ادّعاء کا نتیجہ نہیں ہوتا ہے، بلکہ یا تو یہ اس کے اس اعتقادِ راسخ (CONVICTION) کا نتیجہ ہوتا ہے جو اس کے دل کے اندر جوش مار رہا ہوتا ہے یا اس ہمدردی اور دل سوزی کا اثر ہوتا ہے جس کی آگ اس کے سینہ کے اندر بھڑک رہی ہوتی ہے۔ جو لوگ ایک داعی کی اس خاص حالت سے واقف نہیں ہوتے اور محض قرطاس و قلم کے مشغلہ کے اشتراک کی وجہ سے اسے بھی اپنا ایک ہم پیشہ سمجھے بیٹھے ہوتے ہیں وہ جب دیکھتے ہیں کہ اس کا کلام ان کے کلام کی طرح مردہ اور بے روح نہیں ہے، بلکہ زندہ اور زندگی بخشنے والا ہے تو اس کے جوش کو غرور اور ادّعاء پر محمول کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ شکل و صورت کے اتحاد کے باوجود سیرتیں مختلف ہوا کرتی ہیں، کچھ ضروری نہیں کہ ہر سفید چیز چربی ہی ہو

تو و طوبیٰ وما وقامت یار
فکرِ ہر کس بقدر ہمتِ اوست

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ:

كان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم اذا خطب احمرّت عيناه، وعلا صوته، واشتدّ غضبه۔ حتّٰى كانّه مُنذر جيش،

یقول: صبّحکم و مسّاکم[1]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ دیتے آنکھیں سرخ ہو جاتیں، آواز بھاری ہو جاتی، جوش تیز ہو جاتا۔ یہاں تک کہ معلوم ہوتا کہ آپ کسی دشمن فوج کے آپڑنے کے خطرہ سے آگاہ کررہے ہیں، فرماتے: وہ تم پر صبح کو آپڑے یا شام کو!''

ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں یہ گرمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یقین اور قوم کے ساتھ ہمدردی کے جذبہ سے پیدا ہوتی تھی اور سچے داعی پر اس طرح کی حالت طاری ہو سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض لوگ بالکل نمائشی طور پر بھی جوش و جذبہ کا اظہار کیا کرتے ہیں، بلکہ بسا اوقات وعادی اور شطحات پر بھی اتر آتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر شخص ایسا ہی ہو۔ جو لوگ جھوٹے ہوتے ہیں وہ زیادہ دنوں تک اپنے جھوٹ کو چھپا نہیں سکتے۔ زمانہ کھرے کھوٹے میں امتیاز کر ہی لیتا ہے۔ کوا نمائشی پر لگا کر کب تک طاؤس بنا پھرے گا۔

پانچویں خصوصیّت

پانچویں خصوصیّت ان کے کلام کی یک رنگی اور وحدتِ مقصد ہے وہ اپنے ترکش کا ہر تیر ایک ہی نشانہ پر مارتے ہیں۔ پیشہ ور مضمون نگاروں اور مقرروں کی طرح ان کا طریقہ یہ نہیں ہوتا کہ آپ ان سے جس پلیٹ فارم پر چاہیں تقریر کرالیں، جس عنوان پر چاہیں مضمون لکھا لیں اور جس جلسہ کی چاہیں صدارت کرالیں۔ وہ اپنے لفظ لفظ اور فقرہ فقرہ کو اللہ کی دی ہوئی امانت سمجھتے ہیں اس کے خاص مصرف کے سوا کہیں اور اس کو ضائع نہیں کرتے۔ آپ ان کی ہر تحریر و تقریر میں ایک ہی صدا پائیں گے۔ دوسرے موضوع کتنے ہی دل فریب کیوں نہ ہوں، ان پر تقریر و تحریر سے کتنی ہی بڑی عزت و شہرت کیوں نہ حاصل ہو رہی ہو، بظاہر ان میں دینی و ملی فوائد کا کوئی پہلو بھی کیوں نہ نظر آ رہا ہو، لیکن وہ کسی غیر متعلق یا ضمنی چیز پر اپنی

---

[1] صحیح مسلم: کتاب الجمعة، باب تخفیف الصلوة والخطبة

زبان اور اپنے قلم کی قوت صرف نہیں کرے۔ اس چیز کو قرآن نے ﴿فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ﴾ (الشعرآء۲۶:۲۲۵) ہر وادی میں بھٹکنے سے تعبیر کیا ہے اور انبیاء اور صلحاء کو اس سے بری قرار دیا ہے۔ اس دنیا کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ اس دنیا میں برا یا بھلا، کوئی انقلاب اگر پیدا ہوا ہے تو انہی لوگوں کے زبان وقلم سے ہوا ہے جنہوں نے اپنی ساری قوت کسی متعین ہدف پر صرف کی ہے، یوں ہی ہوا میں چوبائی تیر نہیں پھینکتے رہے ہیں۔

چھٹی خصوصیّت

چھٹی خصوصیّت یہ ہے کہ وہ اپنے کلام کو ہر اس چیز سے پاک رکھتے ہیں جو مخاطب کے اندر ضد اور مخالفت کا جذبہ پیدا کرے، کیونکہ یہ چیز ان کے مقصد کے بالکل خلاف ہے۔ مثلاً مخاطب سے گفتگو کے وقت نہ تو اپنی برتری کا اظہار کریں گے، نہ اس کی غلط زندگی پر باندازِ استخفاف تنقید کریں گے، بلکہ جو کچھ کہیں گے نرمی اور ہمدردی کے ساتھ کہیں گے:

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾ (طٰہٰ۲۰:۴۳-۴۴)

”تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، بے شک وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ پس اس کو نرمی کے ساتھ دعوت دو، شاید وہ یاددہانی حاصل کرے یا ڈرے۔“

اسی طرح وہ اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نہیں نکالتے جس سے مخاطب کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگے۔ دلائل سے اس کے غلط مزعومات کی پرزور تردید تو کرتے ہیں، لیکن خواہ مخواہ نحیف الفاظ استعمال کر کے اپنے مقصد کو اپنے ہی ہاتھوں نقصان نہیں پہنچاتے:

وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ (الانعام۶:۱۰۸)

”اور اللہ کے سوا یہ جن کو پکارتے ہیں ان کو گالی نہ دیجیو کہ وہ تجاوز کر کے بے خبرانہ اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔“

مخاطب کی ترش کلامی اور بدسلوکی کا جواب بھی شیریں کلامی سے دیتے ہیں، کیونکہ ایک داعی حق کے لیے دلوں کے اندر راہ پانے کا طریقہ یہی ہے:

وَ لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَ لَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَ بَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَ مَا يُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۳۵﴾ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۶﴾

(حم السجدۃ ۴۱: ۳۴-۳۶)

''اور بھلائی اور برائی، دونوں یکساں نہیں ہیں۔ تم برائی کو اس چیز سے دفع کرو جو زیادہ بہتر ہے تو تم دیکھو گے کہ وہی، جس کے اور تمہارے درمیان عداوت ہے، گویا وہ ایک سرگرم دوست بن گیا ہے۔ اور یہ دانش نہیں ملتی مگر انہی لوگوں کو جو ثابت قدم رہنے والے ہوتے ہیں اور یہ حکمت نہیں عطا ہوتی مگر انہی کو جو بڑے نصیبہ ور ہوتے ہیں! اور اگر شیطان تمہارے دل میں کوئی اکساہٹ پیدا کر ہی دے تو اللہ کی پناہ ڈھونڈو بے شک حقیقی سننے والا جاننے والا وہی ہے۔''

مناظرانہ اندازِ کلام سے ہمیشہ بچتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر مخاطب کے متعلق اندازہ ہو جائے کہ وہ مناظرہ پر اتر آیا ہے تو داعی حق سلام کر کے وہاں سے چل دیتا ہے، کیونکہ مناظرہ بازی اور دعوت حق میں تضاد ہے:

فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِی الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰی رَبِّكَ ۭ اِنَّكَ لَعَلٰی هُدًی مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۶۷﴾ وَ اِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۸﴾ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۶۹﴾

(الحج ۲۲: ۶۷-۶۹)

''تو وہ اس معاملے میں تم سے نزاع کی راہ نہ پائیں اور اپنے رب کی طرف بلاتے رہو۔ بے شک تم ہی سیدھی راہ پر ہو۔ اور اگر وہ تم سے جھگڑا کریں تو کہہ دو کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ

تم کر رہے ہو۔ اللہ فیصلہ کرے گا تمہارے درمیان قیامت کے دن اس چیز کا جس میں تم اختلاف کر رہے ہو۔"

مناظرہ اگر کرتے بھی ہیں تو نہایت بہتر طریق پر، یعنی اپنے اور مخاطب کے درمیان قدرِ مشترک تلاش کر کے، ان کے لوازم ونتائج کی دعوت دیتے ہیں:

وَ لَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ اِلٰهُنَا وَ اِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۝ (العنکبوت۲۹:۴۶)

"اور اہل کتاب سے نہ بحث کرو مگر اس طریقہ پر جو بہتر ہے، بجز ان کے جو ان میں سے ظالم ہیں اور کہو کہ ہم ایمان لائے اس چیز پر جو ہم پر نازل ہوئی اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف اتاری گئی اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔"

ساتویں خصوصیّت

داعی حق کے کلام کی ساتویں خصوصیّت یہ ہے کہ وہ لفظ اور معنی، طول اور اختصار، اندازِ بیان اور لب ولہجہ میں سننے والے کی نفسیات کا پوا لحاظ رکھتا ہے۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خوشخبری دو اور لوگوں میں نفرت نہ پیدا کرو۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ جب نصیحت کرو تو مختصر کرو۔

خطبہ کے اختصار کو خطیب کی دانش مندی کی علامت قرار دیا:

یقول: ان طول صلاة الرجل، وقصر خطبته، مَئِنّة مِن فقهه. فاطيلوا الصّلاة واقصروا الخطبة. وان من البيان سحرًا۔[1]

"فرماتے تھے: آدمی کی نماز کا طویل ہونا اور خطبہ کا مختصر ہونا اس کی سوجھ بوجھ کی علامت ہے۔ تو نماز لمبی کرو اور خطبہ مختصر کرو۔ اور بعض بیان جادو ہوتے ہیں۔"

---

[1] صحيح مسلم: كتاب الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة

اگر مخاطب کم فہم ہو یا بات باریک ہو تو بات کو دہرا دینا چاہیے تاکہ سننے والا اچھی طرح سن سکے اور اس کو سمجھ سکے:

عن انس عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انہ کان اذا تکلّم بکلمۃ اعادھا ثلاثاً حتّٰی تفھم عنہ[1]

"حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات فرماتے تھے تو اسے تین بار دہراتے تھے تاکہ خوب سمجھ میں آجائے۔"

[1] صحیح البخاری: کتاب العلم، باب ۳۰

باب ۸

انبیائے کرام کا طرزِ استدلال

حضرات انبیائے کرام اور داعیانِ حق جس مقصد کو لے کر اٹھتے ہیں وہ ایمان کی دعوت ہے۔ ایمان کوئی منفی چیز نہیں ہے، بلکہ ایک مثبت حقیقت ہے۔ اس کا اصلی فائدہ صرف اس صورت میں حاصل ہوتا ہے جب یہ پوری طرح دل میں راسخ ہو۔ یہ استحکام و رسوخ پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد نہایت پائدار اور محکم استدلال پر ہو۔ اس کے بغیر نہ تو یہ ایمان زندگی کے لیے ایک محرک کا کام دے سکتا ہے، نہ اس سے دین کی تمام اعتقادی و عملی جزئیات وجود میں آسکتیں اور نہ یہ زندگی کے وسیع الاطراف گوشوں میں انسان کی نگرانی کر سکتا۔ اس وجہ سے داعیانِ حق کا کام نہ مجرد تحکّم سے چل سکتا، نہ مغالطہ دے کر وہ اپنا مقصد حاصل کر سکتے، نہ الزامی قسم کے دلائل ان کے کام آسکتے، نہ محض شاعرانہ اور خطیبانہ قسم کا استدلال، جو فطرت اور عقل کی اندر اپنی کوئی اساس نہ رکھتا ہو، ان کے مقصد کو پورا کر سکتا۔ اس طرح کے مجادلانہ اور الزامی و خطابی طرزِ استدلال سے وہ لوگ تو بے شک اپنا کام چلا لے جاتے ہیں جن کے پیشِ نظر صرف مخاطب کو ساکت کر دینا یا اس کو مغالطہ میں ڈال کر اپنا کوئی مقصد حاصل کر لینا ہو۔ لیکن جن کے سامنے مخاطب کو چپ کرانا نہیں، بلکہ اس کی تمام قوتوں اور قابلیتوں کو صحیح راہ پر چلنے کے لیے بیدار کرنا ہو، اور جن کا مقصد لوگوں کو مسحور یا مرعوب کر کے کسی راہ پر ہانک دینا نہیں، بلکہ ان کی فطرت اور عقل کو اس طرح جگا دینا ہو کہ

مشکل سے مشکل راہوں میں ہر شخص خود اپنی رہنمائی کر سکے، وہ اوّلاً تو استدلال کی ان قسموں کو سرے سے ہاتھ ہی نہیں لگاتے اور اگر لگاتے بھی ہیں تو اس امر کو پوری طرح نگاہ میں رکھتے ہیں کہ ایک پاک اور اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ اس کے وسائل و ذرائع بھی نہایت پاک اور اعلیٰ ہوں۔ اس چیز نے انبیائے کرام اور داعیانِ حق کے طرزِ استدلال کو دوسروں کے طرزِ استدلال سے بالکل ممیّز کر دیا ہے جس کی بعض نمایاں خصوصیات کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

استدلال کی عمومیت

استدلال ہوا اور پانی کی طرح ایک ضرورت کی چیز ہے۔ ہر انسان زندگی کو صحیح طور پر بسر کرنے کے لیے ایمان کا محتاج ہے اور محکم ایمان بغیر محکم استدلال کے حاصل نہیں ہو سکتا، اس وجہ سے استدلال کے لیے دو باتیں ضروری ہوئیں۔ پہلی یہ کہ استدلال کا طریقہ اتنا فطری اور سادہ ہو کہ ہر شخص جس طرح اپنی ضرورت کے مطابق زمین اور فضا کے ذخیرۂ آب و ہوا سے ہوا اور پانی حاصل کر لیتا ہے اور اس میں اس کو کوئی خاص دقت نہیں پیش آتی، اسی طرح ہر شخص زمین و آسمان کے آثار و آیات سے اپنے اطمینانِ قلب کے لیے جس قدر چاہے دلیلیں پیدا کر لے اور اس میں اس کو تفکر اور تذکر کے سوا کسی اور چیز کا اہتمام نہ کرنا پڑے۔ دوسری یہ کہ جس طرح انسان کی جسمانی صحت کے لیے ضروری ہے کہ جس پانی کو وہ پی رہا ہے وہ صاف ہو اور جس ہوا میں سانس لے رہا ہے وہ تازہ ہو، اسی طرح اس کی عقلی صحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جس استدلال سے اصولِ زندگی حاصل کر رہا ہے وہ بالکل بے آمیز، بالکل خالص اور بالکل پاک ہو۔ ان دونوں باتوں کو حاصل کرنے کے لیے حضرات انبیائے کرام اور داعیانِ حق کا ہمیشہ یہ طریقہ رہا ہے کہ انھوں نے ایک طرف تو استدلال و حجّت کے ان مصنوعی طریقوں سے ہٹ کر اپنی راہ نکالی ہے جو کسی قوم میں علمی و فنی ترقیوں سے پیدا ہو جایا کرتے ہیں اور ایک خاص پیشہ ور گروہ کے سوا دوسرے اس سے

فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ دوسری طرف اس تمام مواد کا انہوں نے جائزہ لیا ہے جو استدلال و حجت کے لیے کام میں لایا جاتا رہا ہے اور اس سے چھانٹ کر صرف اس چیز کو وہ حجّت و استدلال کے لیے کام میں لائے ہیں جو ہر قسم کی غیر فطری ملاوٹ سے پاک ثابت ہوا ہے۔ اس طرزِ استدلال کا پہلا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کا ایک انبوہِ عظیم جو اس سے پہلے بالکل اندھا بہرہ بنا ہوا گنتی کے چند انسانوں کے پیچھے پیچھے چل رہا ہوتا ہے دفعتہً خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے کانوں سے سننے لگتا ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اب تک سڑے گلے موادِ استدلال کے نگلتے رہنے کی وجہ سے دلوں اور روحوں پر جو مُردنی طاری تھی اس صالح موادِ استدلال کے چند لقمے حلق میں سے اتارتے ہی دفعتہً دور ہو جاتی ہے اور کھانے والا اپنے آپ کو بالکل تازہ دم اور چاق و چوبند محسوس کرنے لگتا ہے۔

داعیانِ حق اور انبیائے کرام کے طرزِ استدلال کی یہی وہ خصوصیّت ہے جس کی وجہ سے عقلِ انسانی ان کے زمانے میں کروٹ لیتی ہے اور ایک عام ذہنی بیداری ہر گوشہ میں نمودار ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ان گوشوں میں بھی ایک حرکت پیدا ہو جایا کرتی ہے جہاں سے کسی اچھی خبر کی کسی کو بھی امید نہیں ہوتی۔ ہر طرف تنقید کی نگاہیں کھل جاتی ہیں۔ ہر آنکھ دیکھنے اور ہر زبان بولنے لگتی ہے۔ فکر و استدلال کے پرانے طریقے، جو اب تک نہایت محبوب چلے آ رہے ہیں، فرسودہ اور دقیانوسی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ بہت سے نظریات جنہوں نے وحی و الہام کا درجہ حاصل کر رکھا تھا بالکل بے مصرف اور بے وقعت ہو جاتے ہیں۔ یہ ذہنی انقلاب ان لوگوں پر بہت گراں گزرا کرتا ہے جو اپنی قدیم محبوبات و مالوفات کو حق سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ اس میں مزاحمت پیدا کریں، لیکن نہ تو اس چیز کو روکا جا سکتا، نہ اس کو روکنا صحیح ہے۔ البتہ جس چیز کی نگرانی کی ضرورت ہے وہ یہ چیز ہے کہ جو ذہنی آزادی پیدا ہو رہی ہے اس کا بہاؤ صحیح رخ پر ہو، اس میں بے اعتدالی اور مطلق العنانی نہ پیدا ہونے پائے۔ چنانچہ اس فرض سے داعیانِ حق خود اچھی طرح آگاہ ہوتے ہیں۔ اور وہ اس بات کی پوری نگرانی کرتے ہیں کہ جو فکری آزادی

وہ ولوگوں کو دے رہے ہیں وہ ان کے لیے نجات کا ذریعہ ہو، ہلاکت کا سبب نہ بنے۔

مخاطب کے اندر فکر صالح کی تخم ریزی

انبیاء اور اہلِ حق کے طرزِ استدلال کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف دلیل نہیں دیتے، بلکہ مخاطب میں استدلال کرنے کی قابلیت بھی پیدا کرتے ہیں وہ انفرادی و اجتماعی زندگی میں جس ہمہ گیر انقلاب کی دعوت لے کر آتے ہیں وہ انقلاب اس وقت تک پائدار بنیادوں پر قائم نہیں ہوسکتا جب تک وہ انسان کی فکری ونظری صلاحیتوں کو پوری طرح جگا نہ دیں۔ زندگی کوئی مفرد اور بسیط چیز نہیں ہے کہ اس کو صحیح طور پر گزار دینے کے لیے چند گنے چنے اصولوں کی رہنمائی کافی ہو سکے۔ یہ گونا گوں ظاہری و باطنی مطالبات و مقتضیات کا مجموعہ، بے شمار انفرادی واجتماعی روابط وعلائق کا شیرازہ، ان گنت شخصی، عائلی اور نوعی حقوق و فرائض کا ایک گنجینہ ہے۔ پھر وہ پوری کی پوری ہماری نظروں کے سامنے موجود بھی نہیں ہے کہ ہر شخص کی گرفت میں آسکے اور تجربہ ومشاہدہ کی روشنی میں اس کی ہر حالت کے لیے پہلے سے ایک حکم متعین ہو سکے، بلکہ اس کا ماضی اور مستقبل، دونوں غیب کے پردوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ صرف تھوڑا سا حاضر ہے جس کے اشارات کی روشنی میں اس کے ماضی کو بھی سمجھنا پڑتا ہے اور اسی کی رہنمائی سے اس کے مستقبل کو بھی معین کرنا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں زندگی کی رہنمائی کے لیے قانون وآئین کے صرف متعین ومحدود ضابطے کافی نہیں ہو سکتے، بلکہ ضروری ہے کہ اس ضابطہ کے ساتھ انسان کے اندر فکر صالح کی ایک ایسی کبھی نہ بجھنے والی روشنی بھی ہو جو زندگی کے ان مخفی گوشوں میں بھی اس کی رہنمائی کر سکے جن میں رہنمائی کے لیے اس کے پاس کوئی ضابطہ نہ ہو۔ یہ فکر صالح انبیاء اور اہلِ حق کے طرزِ استدلال سے خود بخود مخاطب کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ انبیاء جب اپنی اصولی تعلیمات کا آغاز کرتے ہیں تو اس کی طرح ہی اس طرح ڈالتے ہیں کہ اس فکر صالح کی تخم ریزی کے لیے خود بخود دلوں اور روحوں کے اندر زمین بھی ہموار ہو جاتی ہے اور اس کے بیج بھی پڑ جایا

کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوتے ہیں تو ایک طرف شریعت کا ایک شاداب باغ تیار موجود ہوتا ہے جو ہر شخص کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے اور دوسری طرف حکمت کا ایک لہلہاتا ہوا چمن بھی وہ ہر قلب صالح کے اندر اگا دیتے ہیں جو اگرچہ نگاہوں کے سامنے نہیں ہوتا، لیکن اس کی بہار ہمیشہ قائم اور اس کی شاخیں ہر موسم میں ثمر بار رہتی ہیں۔ بظاہر تو اس کی حیثیت انبیاء کی اصل تعلیم کے مقابل میں ایک ضمنی کاشت اور ضمنی پیداوار کی ہے، لیکن اپنی قدر و قیمت اور اپنے بیش بہا فوائد کے اعتبار سے یہ اصل کے برابر جگہ پاتی ہے۔ یہی چیز ہے جس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے قرآن دیا گیا اور اسی کے مثل اس کے ساتھ ایک اور چیز۔ اسی شجرِ مبارک کے پھل پھول ہیں ہمیں احادیث کی صورت میں ملے ہیں۔ یہی چیز ہے جس کی نسبت قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ جس کو یہ چیز ملی اس کو خیرِ کثیر کا خزانہ ملا۔ اسی کی نسبت قرآن میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ صرف نصیبہ ور لوگ ہی ہیں جن کو یہ چیز ملتی ہے۔ اور اسی کو بعض احادیث میں ایسے خزانہ سے تشبیہ دی گئی ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔

منطقی طرزِ استدلال

یہ تخلیقی صفت صرف اہلِ حق اور حضرات انبیائے کرام کے طرزِ استدلال کے ساتھ مخصوص ہے۔ کسی مناظر و متکلم کے استدلال میں یہ چیز آپ کو نہیں مل سکتی۔ ہمارے علماء منطقی طرزِ استدلال کو بڑی اہمیت دیتے رہتے ہیں، لیکن منطقی طرزِ استدلال اس پہلو سے سب سے زیادہ ناقص ہے۔ منطق کو زیادہ سے زیادہ جو عزت دی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک استدلال کو اپنی کسوٹی پر جانچ کر وہ بتا سکتی ہے کہ یہ استدلال صحیح ہے یا نہیں۔ استدلال کی قابلیت پیدا کرنا اس کے بس سے باہر ہے اور یہ کام بھی منطق سے صرف ایک خاص حد تک ہی لیا جا سکتا ہے۔ قرآن میں اور انبیائے کرام کے کلام میں ہم کو استدلال کی ایسی نازک قسمیں بھی ملتی ہیں جن کو منطق کی ترازو پر سرے سے تولا ہی نہیں جا سکتا لیکن ہمارے

متکلمین، جنہوں نے منطق کو اس کی حیثیت سے زیادہ درجہ دیا، نے کوئلہ تولنے کی اسی ترازو سے قرآن کی ان اشرفیوں کو بھی تولنا چاہا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اشرفیوں کو کوئلوں سے بھی کم تر قرار دے بیٹھے۔

باقی رہے اہلِ فلسفہ تو اس میں شبہ نہیں کہ وہ فکرِ انسانی کو اس بات کی تربیت ضرور دیتے ہیں کہ وہ استدلال و استنباط کے مختلف میدانوں میں جولانی کر سکے۔ لیکن انہوں نے اپنے موادِ استدلال، اپنے طرزِ استدلال اور اپنے ذرائع استدلال، تینوں کو رطب و یابس کا مجموعہ بنا دیا ہے جس کی وجہ سے ان کے طریقے پر سوچنے والا انسان حیرانی و سرگشتگی کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ ان کی رہنمائی میں اگر انسان چند قدم صحیح راہ میں اٹھاتا ہے تو ساتھ ہی مجبور ہوتا ہے کہ چند قدم غلط سمت میں بھی اٹھائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی ساری زندگی مختلف وادیوں کی آوارہ گردی اور اٹکل کے تیر تکے چلانے میں گزر جاتی ہے اور چند متناقض و متضاد، الجھے ہوئے افکار کے سوا اس کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ اس معاملہ میں فلسفہ قدیم ہو یا فلسفہ جدید، سب کا حال یکساں ہے۔ سب کے اصولِ فکر میں الجھاؤ اور ہر ایک کے نتائج فکر میں پریشانی ہے اور اب تو جب کہ سائنس کی ترقیوں نے سارا مدار تجربہ و مشاہدہ پر قائم کر دیا ہے اور انسان اس خبط میں مبتلا ہو گیا ہے کہ وہ کوئی چیز بھی بغیر سر کی آنکھوں سے دیکھے ہوئے نہیں مانے گا سرے سے توقع ہی اس بات کی نہیں رہ گئی ہے کہ اس کا ایک قدم بھی جادۂ مستقیم پر پڑے گا۔ اب تک فلسفہ کی بنیاد جن اصولوں پر تھی ان میں سے اگر بعض غلط تھے تو بعض صحیح بھی تھے۔ جس کی وجہ سے اس کے خوابہائے پریشاں میں سے بعض سچے بھی نکل آتے تھے اور آدمی کے لیے صرف سچے اور جھوٹے میں امتیاز کی مشکل تھی۔ لیکن اب تو سارا تکیہ حِس و مشاہدہ پر رہ گیا ہے اور حِس و مشاہدہ کی جہانگیری معلوم ہے کہ وہ کہاں تک ہے۔ اس مادی فلسفہ کے علاوہ آج اگر کوئی چیز فلسفہ کے نام سے موجود ہے تو وہ اہلِ تشکیک کا فلسفہ ہے جس کی ساری بنیاد حواس و عقل کی بے اعتباری پر قائم ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی فلسفہ نہیں، بلکہ تمام علم و فلسفہ کی کلی نفی ہے اور دنیا کو حیرانی کے سوا اس سے

کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔

حضرات انبیاء کرام کا طریقہ استدلال نہ اہلِ منطق کے طریقہ کی طرح بانجھ ہے اور نہ اہلِ فلسفہ کے طریقہ کی طرح پریشان کن۔ بلکہ وہ فکرِ انسانی کی اس طرح تربیت کرتے ہیں کہ وہ خود بخود صحیح راہ پر چلنے لگے اور منزلِ مقصود کا سراغ اس کے اندر یہ یقین پیدا کردے کہ اس نے جو راہ اختیار کی ہے وہ صحیح ہے۔ وہ پہلے تو ماخوذ استدلال کی طرف توجہ دلاتے ہیں، یعنی آفاق و انفس کی طرف، آفاق سے مراد نظامِ کائنات کے وہ آثار و آیات اور قوانین و ضوابط ہیں جو اس دنیا میں ہر شخص کو بادنیٰ توجہ نظر آتے ہیں۔ انفس سے مراد وہ قوتیں اور قابلتیں اور وہ یقینیات ہیں جن کو ہر انسان اپنے اندر دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ وہ ان میں سے نمایاں چیزوں کی طرف انگلی اٹھاتے ہیں اور ان سے جو باتیں لازم آتی ہیں ان کو پیش کرتے ہیں۔ یہ پیش کرنا کبھی تو ایسی تصریح کے ساتھ ہوتا ہے کہ پوری بات بالکل بے نقاب ہوکر سامنے آجاتی ہے اور کبھی تربیت کے خیال سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ لازمی نتیجہ کی طرف صرف اشارہ کردیا جاتا ہے تاکہ مخاطب خود اس نتیجہ تک پہنچے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ مخاطب میں صحیح نتائج نکالنے کی قابلیت پیدا ہوجاتی ہے جو زندگی کے سفر میں، ہر مرحلہ میں، اس کے کام آتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو دوسرے کی بات سمجھ کر اس کی تردید یا انکار کے درپے نہیں ہوتا، بلکہ اس کو خود اپنا نتیجہ فکر سمجھ کر اس کو قبول کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ تیسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرح مخاطب و متکلم میں استاد و شاگرد کے بجائے باہم وگر رفیق کی نسبت پیدا ہوجاتی ہے اور مخاطب میں یہ احساس کمتری نہیں پیدا ہوتا کہ میں اس نتیجہ تک دوسرے کی انگلیاں پکڑ کے پہنچا ہوں۔ بلکہ وہ یہ خیال کرتا ہے کہ ہم دونوں مشترک طور پر اس نتیجہ تک پہنچے ہیں۔ یہ باتیں مقصدِ دعوت کو اتنے مختلف پہلوؤں سے فائدہ پہنچاتی ہیں کہ ان کی تفصیل کے لیے یہاں گنجائش نہیں ہے۔

یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں ہے کہ استدلال کی ساری قسموں میں فطرتِ انسانی سے سب سے زیادہ مناسبت رکھنے والی قسم یہی لوازم سے استدلال کی قسم ہے۔ اس وجہ سے اہلِ حق

اور حضرات انبیائے کرام نے اس کو سب سے زیادہ برتا ہے۔ آدمی جب ایک امر کا آفاق میں مشاہدہ کرتا ہے یا اپنی فطرت کے اندر اس کا یقین محسوس کرتا ہے تو جو باتیں اس سے لازم آتی ہیں ان کا انکار نہیں کرسکتا، بشرطیکہ وہ صحیح ترتیب کے ساتھ اس کے سامنے پیش کی جائیں۔ اگر انکار کرے گا تو محض زبان سے انکار کرے گا، اس کا دل اس کے اس انکار کا ساتھ نہ دے گا۔ اور اس انکار پر اس کے لیے زیادہ دنوں تک جمے رہنا صرف اسی حالت میں ممکن ہے جب وہ کھلا ہوا معاند اور ہٹ دھرم ہو۔ ایک امر کے لوازم کی حیثیت اجمال کے بعد تفصیل کی ہوا کرتی ہے اور ہر آدمی سے، جس میں حق پرستی اور سچائی کی کوئی رمق باقی ہے، توقع کی جاتی ہے کہ وہ جس بات پر مجملاً ایمان رکھتا ہے اس کی تفصیلات اور لوازم کو تسلیم کرنے سے بھی وہ گریز نہ کرے گا، جن لوگوں نے قرآن مجید کے دلائل پر غور کیا ہے وہ ہماری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس کے بیشتر دلائل کی نوعیت یہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو شخص قرآن، اپنے دل کو ہر طرح کے تعصّبات سے پاک کر کے، پڑھتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے ہی صحیفہ دل کی تلاوت کر رہا ہے اور اس کی ہر صدا اسے اپنے ہی ضمیر و دل کی آواز کی طرح مانوس معلوم ہونے لگتی ہے۔

غلط مسلّمات پر بنیاد رکھنے سے احتراز

اہلِ حق اور انبیائے کرام کے طرزِ استدلال کی تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ عام اہلِ مناظرہ کی طرح مخاطب کے کسی غلط مسلمہ کو بنائے استدلال نہیں بناتے۔ اگر ایک شخص ایک غلط بات کو مان رہا ہے تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے، نہ کہ اس کی غلطی کی وجہ سے اس کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ چند اور غلطیوں کو بھی تسلیم کرے۔ جو لوگ اپنے مخاطب کو صرف خاموش کر دینے کا شوق رکھتے ہیں، یا اس کو اپنی بات کے آگے جھکانا چاہتے ہیں، یا اس کو کسی مغالطہ میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں، ان کے استدلالی کارناموں میں سب سے زیادہ اہمیت اسی چیز کو حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اہلِ حق اس چیز سے اس قدر

گریز کرتے ہیں کہ اگر مخاطب کے کسی غلط مسلمہ پر اپنے کسی حق کو بھی ثابت کر سکتے ہوں، جب بھی وہ ایسا نہیں کرتے۔ ان کی نظروں میں اس حق کو کوئی وقعت نہیں ہے، جس کی بنیاد کسی باطل پر ہو۔ اس طرح کا کھوکھلا اور بے اساس حق مناظرہ کی مجلسوں میں ممکن ہے کچھ دیر کے لیے اپنی چمک دمک دکھاوے لیکن زندگی کی مہمات میں یہ کچھ کام نہیں دیتا۔ زندگی کی مہمات میں صرف وہ حق کام دیتا ہے جس کی جڑیں فطرتِ انسانی کے اندر دور دور تک پھیلی ہوئی ہوں اور اس کی وسعتوں کا یہ حال ہو کہ تمام فضا اس کے برگ و بار میں چھپ جائے۔ ہمارے متکلمین نے بالعموم یہ غلطی کی ہے کہ اسلام کے کسی اصول کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے جب وہ اپنی کوئی بنیاد نہ قائم کر سکے تو انہوں نے دوسروں ہی کے کسی نظریہ اور واہمہ کو اساس بنا کر اسی پر اپنے مزعومات کی عمارت کھڑی کر دی۔ اس طرح کی غلط وکالت سے اسلام کو جو نقصان پہنچا ہے اس قدر اسلام کے مخالفین کی مخالفتوں سے اس کو نہیں پہنچا۔ اسلام کے کسی اصول کو صحیح عقلی وفطری دلائل سے نہ ثابت کر سکنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ خدانخواستہ اسلام اپنے اصولوں کی سچائی کے عقلی وفطری دلائل رکھتا ہی نہیں، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ حضرات غیر فطری عقلیات سے اپنا مذاق اس قدر بگاڑ چکے تھے کہ اسلام کی عقلیت کی قدر و قیمت کو یہ پہچان ہی نہیں سکتے تھے۔ ایسی صورت میں ان کے لیے صحیح راہ یہ تھی کہ خواہ مخواہ کو اسلام کی وکالت کا بیڑا نہ اٹھاتے، بلکہ اپنے جن دھندوں میں مشغول تھے انہیں میں مشغول رہتے۔ لیکن دینِ آباء ہونے کی حیثیت سے اسلام کے لیے ان کے دلوں میں جو عصبیت تھی وہ انہیں اکساتی تھی کہ وہ جس دین کا نام لیتے ہیں عقلی اصولوں پر اس کی سچائی بھی ثابت کریں۔ اسلام کی عقلیت ان کے فسادِ مذاق اور قرآن سے محرومی کی وجہ سے ان کے دلوں کو اپیل نہیں کرتی تھی۔ اس وجہ سے انہوں نے چاہا کہ اس کو اسی عقلیت کے معیار پر پورا ثابت کر دکھائیں جو ان کے زمانوں میں مقبولِ عام و خاص ہے، ان کی اس غلط کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی محکم اور سچی تعلیمات کی ساری عمارت اس کی اپنی چٹان سے زیادہ مضبوط بنیادوں سے ہٹا کر بالکل کمزور اور پھس پھسی بنیادوں پر

کھڑی کردی گئی۔ ان حضرات نے یہ کوشش کتنی ہی نیک نیتی سے کی ہو، لیکن اس کے نتائج نہایت خطرناک نکلے۔ زمانہ کے امتداد اور سائنس کے اکتشافات نے جب وہ نظریات بے حقیقت ثابت کر دیے جو کل تک مقبولِ عام تھے تو اس کی زد لازماً اسلام کے ان اصولوں پر بھی پڑی جن کو ان غلط نظریات پر ڈھالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے سبب سے اسلام کے متعلق بہتوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جس طرح وہ نظریات پرانے ہو گئے اسی طرح اسلام بھی پرانا ہو گیا۔ یہ سوئے ظن پیدا کرنے میں جس طرح ہمارے پرانے متکلمین نے حصہ لیا ہے اسی طرح ہمارے نئے متکلمین نے بھی اس میں حصہ لیا ہے اور ان دونوں گروہوں کی مشترک غلطی یہی ہے کہ حق کی حمایت کے لیے انہوں نے حق کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ اس کے لیے باطل کا تعاون ضروری سمجھا۔ حالانکہ حق کے معنی ہی یہی ہیں کہ وہ ثابت اور محکم ہے اور عقل و فطرت کے اندر اس کی جڑیں نہایت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن ہمارے متکلمین یونانیوں کے بتائے ہوئے طریقہ فکر و استدلال کے اتنے خوگر ہو چکے تھے کہ وہ قرآنی طرزِ استدلال کی باریکیوں اور خوبیوں کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ حالانکہ اگر وہ استدلال کی ان خلافِ فطرت روشوں کو چھوڑ کر قرآن اور پیغمبر کے حکیمانہ طرزِ استدلال کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ قرآن کے ہر دعوے کی بنیاد ایسے محکم دلائل پر قائم ہے جو زمان و مکان کی تمام قیود و حدود اور انقلابِ آراء و افکار کی تمام اثر اندازیوں سے بالکل آزاد ہیں۔

قدرِ مشترک کی تلاش

داعیانِ حق کے طرزِ استدلال کی چوتھی خصوصیّت یہ ہے کہ وہ اپنے اور اپنے مخاطب کے درمیان قدرِ مشترک تلاش کر کے اس کو بنائے بحث و استدلال بناتے ہیں، ہر گوشہ میں خواہ مخواہ اپنی انفرادیت اور یکتائی کے اظہار کی کوشش نہیں کرتے۔ نوعِ انسانی اپنے ظاہری اختلافات کے لحاظ سے کتنی ہی متفرق اور پراگندہ کیوں نہ نظر آئے، لیکن اس کے اس تفرق

اور پراگندگی کی تہ میں بے شمار اصول و عقائد ایسے بھی ہیں جن میں سب متحد ہیں۔ آفاق کے قوانین وضوابط، تاریخ کے مسلمات، فطرت کے یقینیات اور بنیادی اخلاقیات میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں شرق وغرب اور عرب وعجم، سب ایک ہی نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ اگر ان کو بحث واستدلال کی اساس قرار دے کر اس بات کی سعی کی جائے کہ منطقی طور پر ان اصولوں سے جو باتیں لازم آتی ہیں لوگ ان میں بھی متفق اللفظ ہو جائیں تو یہ بات ان لوگوں کو اپیل کرتی ہے جو نیک نیت اور سلیم الفطرت ہوتے ہیں۔ زندگی کے جو اصول مشترک ورثہ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے لوازم میں جو اختلاف ہوا کرتا ہے وہ اکثر سوئے فہم اور تقلید سے پیدا ہوا کرتا ہے اور کوشش کر کے اگر اس کو دور کر دیا جائے تو ہر شخص ان اصولوں کو مشترک ورثہ ہی کی حیثیت سے قدر وعزت کی نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے۔

حضرات انبیاء کرام نے ہمیشہ یہی طریقہ استدلال وحجت کے لیے اختیار کیا ہے۔ عرب کے مشرکین اور اہلِ کتاب پر جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اتمامِ حجت فرمایا ہے اس کی تمام تفصیلات قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اس کو پڑھتے ہوئے کہیں یہ گمان بھی نہیں گزرتا کہ ان سے کسی ایسی بات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے جو ان کے لیے بالکل نادر اور انوکھی ہو اور ان کی تاریخ، ان کی روایات، ان کے معروف ومنکر اور ان کے عقائد واخلاق میں اس کی اصل موجود نہ ہو۔ اختلاف جو کچھ نظر آتا ہے وہ صرف اصول کی تعبیر اور ان کے لوازم ونتائج میں نظر آتا ہے اور اسی کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالبہ تھا کہ اصول وجزئیات میں جو تناقض پیدا ہو گیا ہے لوگ اس کو دور کر لیں۔ اگر وہ بات حق ہے جو قرآن مجید کہہ رہا ہے تو اس کو مان لیں۔ اور اگر وہ بات حق ہے جس کے وہ مدعی ہیں تو اس کو صحیح ثابت کر دیں۔

اس طرزِ استدلال کا فائدہ یہ ہے کہ داعی کے متعلق یہ بدگمانی نہیں پیدا ہوتی کہ یہ کوئی ایسا شخص ہے جو اپنی انفرادیت کے زعم میں تمام ماضی پر خطِ نسخ پھیرنا چاہتا ہے اور اپنی شخصیت کا سکہ جمانے کے خبط میں مبتلا ہے۔ بلکہ یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ہمارے ہی اگلوں کا ورثہ ہماری طرف منتقل کرنے آیا ہے اور اگر کچھ لوگ شرارت کی وجہ سے بدگمانیاں پھیلانا بھی

چاہتے ہیں تو زیادہ عرصے تک نہیں پھیلا سکتے۔ اصل حقیقت کا آفتاب نمودار ہو کر بہت جلد ان ظلمتوں کو کافور کر دیتا ہے۔

جو لوگ اہلِ حق کے اس طرزِ استدلال کی خوبیوں اور فوائد سے واقف نہیں ہیں ان کا طرزِ عمل بالعموم اس کے بالکل ضد ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ قدرِ مشترک تلاش نہیں کرتے، بلکہ جو قدرِ مشترک انہیں ملتا بھی ہے، اسے بھی نقطہ اختلاف بنا کے رکھ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کے استدلال اور ان کی دعوت کی اصل خوبی ہی یہی ہوتی ہے کہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ دنیا کے کان اب تک اس سے بالکل نا آشنا رہے ہیں اور آسمان کے نیچے بالکل پہلی مرتبہ انہوں نے اس کو آشکارا کیا ہے۔ ہمارے مناظرین جو اسلامی دعوت کے صحیح مزاج سے واقف نہیں ہیں، وہ بالعموم اسی طرح کے خبط میں مبتلا ہیں۔ وہ اسلام کی کسی حقیقت کو جب بھی پیش کرتے ہیں اس کا اصلی کمال اسی بات میں سمجھتے ہیں کہ اس کو ایک نادر ترین حقیقت ثابت کر دکھائیں۔ یہ چیز قدرتی طور پر طبائع میں اُنس کے بجائے اس سے بیزاری پیدا کرتی ہے اور لوگ بجائے اس کے کہ اسے اپنی چیز سمجھ کر اس کا شوق کریں اسے اجنبی چیز سمجھ کر اس سے نفرت کرنے لگ جاتے ہیں۔

الزامی طریق استدلال سے احتراز

داعیانِ حق کے طرزِ استدلال کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ وہ الزامی طریق استدلال و جواب کبھی اختیار نہیں کرتے۔ الزامی طریق استدلال سے ہماری مراد وہ نہیں ہے جس کو ہم اوپر استدلال باللوازم کے عنوان سے ذکر کر چکے ہیں۔ بلکہ اس سے ہمارا اشارہ ہمارے مناظرین اور متکلمین حال کے اس غلط طریقہ کی طرف ہے جو عموماً وہ موجودہ معترضین اور نکتہ چینوں کے مقابل میں، اسلام کی حمایت کے لیے، اختیار کرتے رہے ہیں۔ ان کا مقبولِ عام طریقہ یہ ہے کہ جہاں کسی مذہب والے نے اسلام کی کسی بات پر اعتراض کیا وہ جھٹ اسی قبیل کی مثالیں حریف کے مذہب کی تعلیمات کے اندر سے پیش کرنا شروع

کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح انہوں نے اسلام کو اعتراض کی زد سے محفوظ کر لیا۔ حالانکہ یہ طریقہ جواب اصولی طور پر غلط ہے۔ دوسرے کی کسی غلطی کی بنا پر ہماری کسی غلطی کا حق ہونا تو الگ رہا ہمارے کسی حق کا حق ہونا بھی مشتبہ ہو جاتا ہے۔ اس طریق استدلال کا فائدہ اگر کوئی ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ معترض چپ ہو جایا کرتا ہے اور اس سے ہمارے غرورِ نفس کو تسلی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے نہ تو مخالف کو اسلام کی حقانیت کا ثبوت ملتا، نہ خود اپنے آپ کو اس سے شرحِ صدر حاصل ہوتا ہے بلکہ یہ الٹا اپنی ہی کمزوری کا نہایت کھلا ہوا ثبوت ہے جو ہم خود اپنی زبان سے دوسروں کے لیے بہم پہنچاتے ہیں۔ ہر امرِ حق اپنی دلیل خود اپنے اندر رکھتا ہے، اس کی دلیل دوسروں کے کسی باطل کے اندر نہیں ہوا کرتی۔ اس وجہ سے صحیح طریقہ صرف یہ ہے کہ اس کے دلائل خود اس کے اندر سے پیش کیے جائیں۔ اس معاملہ میں ہمارے متکلمین کی روش غلط ہونے کی وجہیں دو ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مخالفین کے پراپیگنڈے سے مرعوب ہو جانے کی وجہ سے بسا اوقات اسلام کے بعض نہایت سچے اصولوں کی سچائی خود ان کی اپنی نظروں میں مشتبہ ہو گئی اور انہیں ان کی حمایت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہٗ کار ہی نظر نہیں آ رہا کہ الزامی طریق جواب اختیار کر کے مخالف کو چپ کرائیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان حضرات نے اپنی وکالت وحمایت کی ذمہ داری صرف اسلام ہی کی حد تک محدود نہیں رکھی، بلکہ قومی تعصب کی وجہ سے انہوں نے مسلمان قوم کی پوری تاریخ کی حمایت بھی اپنے سر لے لی، جس کی وجہ سے ان کا محاذ جنگ بہت لمبا ہو گیا اور انہیں بہت سی ایسی چیزوں کا حق ہونا بھی ثابت کرنا پڑا جن کو حق ثابت کرنا اس وقت تک ممکن ہی نہیں تھا جب تک وہ دوسروں کے بہت سے باطل کو بھی حق ثابت نہ کر دیں۔ ہمارے متکلمین کا وہ سارا الٹریچر، جو گزشتہ نصف صدی کے اندر تیار ہوا ہے اور جس میں جہاد، غلامی، تعددِ ازواج طلاق اور مسلمان سلاطین کے کارناموں کے جواز وغیرہ پر بحث کی گئی ہے، وہ تمام تر اسی صورت حال کی شہادت ہے۔ اس کو پڑھ کر کبھی تو ان حضرات کی مرعوبیت اور بے بسی پر افسوس ہوتا ہے اور کبھی ان کی غلط روی پر سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔

حالانکہ اگر وہ پراپیگنڈے سے مرعوب نہ ہوتے اور خواہ مخواہ کو پرائے جھگڑے اپنے سر نہ لیتے، کبھی اپنی حمایت صرف اسلام ہی تک محدود رکھتے تو ان کی بہت سے بوالفضولیوں سے بالکل محفوظ رہ جاتے، جن میں ان کو چار و نا چار مبتلا ہونا پڑا اور جن کی وجہ سے وہ اسلام کی خدمت کرنے کے بجائے اس کی دعوت کی راہ میں بہت سے کانٹے بو گئے، جو ایک ایک کر کے آج ان لوگوں کو چننے پڑیں گے جو اس راہ میں قدم رکھنا چاہیں گے۔

باب ۹

مخاطب کی نفسیات کالحاظ

جس طرح ایک بیج کے نشو ونما پانے کے لیے تنہا بیج کی صلاحیتوں ہی پر نظر نہیں رکھنی پڑتی، بلکہ زمین کی آمادگی و مستعدی اور فصل و موسم کی سازگاری و موافقت کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے، اسی طرح کلمہ حق کی دعوت میں مجرد حق کی فطری صلاحیتوں پر ہی اعتماد نہیں کر لینا چاہیے، بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جن لوگوں کے سامنے وہ حق پیش کیا جا رہا ہے دعوت کے وقت نفسیاتی نقطہ نظر سے ان کی حالت کیا ہے۔ زمینوں کی طرح روحوں اور دلوں کے بھی موسم ہوتے ہیں اور ایک داعی کا فرض ہے کہ ان موسموں سے اسی طرح واقف ہو جس طرح ایک دہقان زمین کی فصلوں اور موسموں کو پہچانتا ہے اور اسی وقت کوئی بیج ڈالے جب موسم سازگار ہو جو لوگ اس اصول کی خلاف ورزی کرتے ہیں، خواہ اپنی سادگی اور بھولے پن کی وجہ سے، یا اس خیال سے کہ حق اپنی ذاتی کشش سے خود بخود دلوں میں جگہ پیدا کر لے گا، اس کے لیے اہتمام کی ضرورت نہیں ہے، وہ اپنی اس غلطی کی سزا اپنی دعوت کی ناکامی کی شکل میں پاتے ہیں اور ان کی نیک نیتی ان کی اس بے تدبیری اور غفلت کے نتائج سے ان کو بچا نہیں سکتی جو مخاطب کی نفسیات کی رعایت کے باب میں ان سے صادر ہوتی ہے۔

نفسیات مخاطب کی رعایت کے دس اصول

ایک داعی کو جن مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے اور ان سے، ان کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر، جتنے مختلف نوعیت کے معاملے اس کو کرنے پڑتے ہیں، ان سب کی تفصیل نہ تو ممکن ہی ہے، اور نہ اس کے لیے یہاں گنجائش ہی ہے، لیکن حضرات انبیائے کرام علیہم

السلام کے طرزِ عمل سے یا ان ہدایات سے جو ان کو اس بارہ میں دی گئی ہیں، بعض اصولی باتیں مستنبط ہوتی ہیں ہیں جو بطورِ مثال ہم یہاں بیان کریں گے تاکہ ان کو پیش نظر رکھ کر لوگ از خود ان سے مزید اصول مستنبط کر لیں۔ اس چیز کا تعلق درحقیقت عام انسانی فہم سے ہے۔ ایک سلیم الطبع اور نیک نیت داعی، جو اپنے مقصد کو اچھی طرح پہچانتا ہے، اگر ان مثالوں کو پیش نظر رکھے گا تو ہمیں امید ہے کہ بہت جلد وہ اپنے طریق دعوت کو انبیاء کے طریق دعوت سے مشابہ بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ یہاں ہم جن اصولی باتوں کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں وہ دس ہیں:

پہلا اصول

ایک ہی چیز کے مختلف پہلو ہوا کرتے ہیں۔ بعض اعتبار سے وہ سہل و آسان ہوتی ہے، بعض اعتبار سے مشکل ہوتی ہے۔ کسی مبتدی کے سامنے اگر اس کو اس پہلو سے پیش کیجیے جو سہل ہے تو اس کو اس سے کچھ ایسی اجنبیت اور نفرت نہیں ہو گی، لیکن اگر پہلی ہی ملاقات میں اس کو دوسرے پہلو سے پیش کر دیجیے تو وہ فوراً اس سے وحشت زدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہو گا اور پھر شاید کبھی اس کے پاس بھی نہیں پھٹکے گا۔ دین حق کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ بے گانہ سے بے گانہ آدمی کے لیے بھی وہ اپنے بعض پہلوؤں سے دل آویز اور دلکش ہے اور اگر اسی پہلو سے اس کو اس کے سامنے پیش کیا جائے تو آہستہ آہستہ وہ اس سے مانوس ہو کر اس کے نرم و سخت سب کو قبول کر لیتا ہے۔ لیکن مانوس سے مانوس آدمی بھی اس کے بعض پہلوؤں کو سخت اور گراں محسوس کرتا ہے اور اگر اس کے سامنے اسی پہلو سے اس کو پیش کیا جائے تو مزید مانوس ہونا تو الگ رہا اندیشہ اس بات کا رہتا ہے کہ اس کا سابق اُنس بھی وحشت و اجنبیت سے بدل جائے۔ جو لوگ ایک شے کے مختلف پہلوؤں اور ان کے فرق کو نہیں جانتے یا اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ ایک مبتدی کے سامنے ایک شے کا کون سا پہلو سب سے پہلے لانا چاہیے یا طبعاً ان کا مذاق ہی اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ ہمیشہ سنگلاخ

زمینوں ہی میں طبع آزمائی کرتے اور ہر بات میں تشدد ہی کو کمال دینداری خیال کرتے ہیں، وہ لوگ جب دعوت دین کا کام سنبھالتے ہیں تو ان کی دعوت کا نتیجہ بالعموم یہی ہوتا ہے کہ لوگ قریب آنے کے بجائے اور زیادہ دور ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوتی کہ یہ لوگ دعوت کے لیے جو راہ اختیار کرتے ہیں وہ انسانی نفسیات کے لحاظ سے بالکل الٹی ہوتی ہے۔ اس سے بشارت کی جگہ نفرت اور اُنس کی جگہ بیزاری پھیلتی ہے۔ اسی چیز سے روکنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: بَشِّـروا ولا تُنفِّروا،[1] (خوشخبری دو، لوگوں میں نفرت نہ پھیلاؤ) اور داعیانِ حق کے لیے صحیح طرزِ عمل یہ بتایا ہے کہ فَاِنَّمَا بُعثتم میسِّرین ولم تبعثوا معسّرین[2] (تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو)۔

دوسرا اصول

نفسیاتی نقطہ نظر سے دوسری اہم چیز، ایک داعی کے لیے قابلِ لحاظ، یہ ہے کہ اسے کسی حال میں بھی اپنے مخاطب کے اندر حمیتِ جاہلیت کے بھڑکنے کا موقع نہیں پیدا ہونے دینا چاہیے۔ ہر داعی حق کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہر قوم اپنے معتقدات و روایات کے ساتھ کم وبیش اس طرح کی وابستگی رکھتی ہے جس طرح کی وابستگی ایک داعی حق اپنے معتقدات کے ساتھ رکھتا ہے۔ یہ وابستگی اگر باطل ہے تو اس کی اصلاح کا راستہ یہ ہے کہ ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے جن کی وجہ سے یہ غلط وابستگی قائم ہے اور ان کی اصلاح کو اس وابستگی کے توڑنے کا ذریعہ بنایا جائے۔ حق پرستی کے جوش یا باطل کی مخالفت کے جذبہ سے مغلوب ہو کر یہ ہرگز نہ کیا جائے کہ اس غلط وابستگی کے فکری اسباب کی اصلاح کے بجائے خود اسی پر براہ راست حملہ کر دیا جائے۔ اس طرح کے براہ راست حملہ کا نتیجہ صرف یہ ہوتا

---

[1] صحیح البخاری: کتاب العلم، باب ۱۱

[2] صحیح البخاری: کتاب الوضوء، باب ۵۸

ہے ـــــ اور یہی ہوسکتا ہے ـــــ کہ مخاطب حمیتِ جاہلیت کے جوش سے بے خود ہو کر دعوت کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس جوش میں وہ ایسا اندھا بہرا ہو جاتا ہے کہ جس اینٹ پتھر پر اس کا ہاتھ پڑ جاتا ہے، وہی اٹھا کر، وہ داعی پر پھینک مارتا ہے۔ سورۂ انعام میں داعیانِ حق کو اسی چیز سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے:

وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۪ (الانعام۶:۱۰۸)

"اور اللہ کے سوا یہ جن کو پکارتے ہیں ان کو گالی نہ دیجیو کہ وہ تجاوز کر کے بے خبرانہ اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کی نگاہوں میں اس کا عمل کھبا رکھا ہے۔"

اسی سے ملتی جلتی ہوئی ایک ہدایت قرآن مجید نے یہ بھی دی ہے کہ دعوت حق کے کام کے سلسلہ میں ساری گفتگو اصل مقصد تک محدود رہنی چاہیے۔ اگر مخاطب کی طرف سے کوئی ایسا پہلو چھیڑ دیا جائے جس سے دونوں فریق کے مقتداؤں اور لیڈروں میں ترجیح و تفصیل کا معرکہ کارزار گرم ہو جانے کا اندیشہ ہو تو داعیانِ حق کو چاہیے کہ بحث کی غلط رَو میں بہہ جانے کی بجائے اس کو صحیح رخ پر لانے کی کوشش کریں اور مخاطب کے لیڈروں اور مقتداؤں کی تحقیر کے بجائے، ان کے لیے اُس عزت و احترام کا اعتراف کریں جس کے وہ واقعی طور پر مستحق ہیں:

وَ قُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۵۳﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ؕ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ؕ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۵۴﴾ وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾

(بنی اسرائیل ۱۷: ۵۳-۵۵)

''اور میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہی بات کہیں جو بہتر ہے۔ بے شک شیطان ان کے درمیان وسوسہ اندازی کرتا رہتا ہے، شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن تو ہے ہی۔ تمہارا رب تم کو خوب جانتا ہے، اگر وہ چاہے گا تم پر رحم فرمائے گا یا اگر چاہے گا تم کو عذاب دے گا اور ہم نے تم کو ان پر مسئول بنا کر مامور نہیں کیا ہے۔ اور تمہارا رب ہی خوب جانتا ہے ان کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت بخشی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔''

اس ہدایت کا مقصد بھی یہی ہے کہ داعی حق کو ان تمام باتوں سے احتراز کرنا چاہیے جو عصبیت جاہلیت کو بھڑکانے والی اور مخاطب کو عناد و اختلاف کی راہ پر ڈال دینے والی ہوں۔

تیسرا اصول

جو لوگ عزت و پیشوائی کے مقام پر سرفراز رہتے چلے آنے کی وجہ سے دوسروں کی طرف سے اپنے لیے خطاب و کلام میں تعظیم و تکریم کے خوگر ہو چکے ہوں اور اندیشہ ہو کہ اس کی خلاف ورزی سے ان کے پندارِ نفس کا شیطان جاگ اٹھے گا اور ان کو حق بات سننے سے روک دے گا، داعی حق کو چاہیے کہ ایک خاص حد تک ان کی اس بیماری کا لحاظ رکھے تاکہ قبول حق میں ان کے اپنے نفس کی مزاحمتوں کے سوا داعی کی طرف سے کوئی جدید مانع نہ پیدا ہو جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی پہلو سے ہدایت کی گئی کہ:

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝۴۳ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝۴۴ (طٰہٰ ۲۰: ۴۳-۴۴)

''تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، بے شک وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ پس اس کو نرمی کے ساتھ دعوت دو، شاید وہ یاددہانی حاصل کرے یا ڈرے۔''

لیکن یہ لحاظ اسی حد تک جائز ہے جہاں تک اس حق کے احترام و وقار کے خلاف نہ ہو، جس کو داعی پیش کر رہا ہے۔ اگر یہ لحاظ کسی پہلو سے حق کے وقار کو صدمہ پہنچائے تو پھر یہ چیز

جائز نہیں ہے۔ قرآن میں صراحت کے ساتھ اس کی ممانعت کر دی گئی ہے۔

چوتھا اصول

جس طرح ایک ماہر طبیب مریض کی عمر، اس کی مزاج اور اس کے مرض کی شدت و خفت کے لحاظ سے اس کے لیے دوا کی خوراک تجویز کرتا ہے، اسی طرح ایک داعی حق کا بھی فرض ہے کہ وہ مخاطب کی استعداد، اس کی طلب اور اس کے ظرف کے لحاظ سے اس کے سامنے دعوت پیش کرے۔ اس چیز کا ٹھیک اندازہ کرنے کے لیے صرف مخاطب کی نوعی استعداد اور نوعی قابلیتوں ہی کو سامنے نہیں رکھنا چاہیے، بلکہ اس کی قومی خصوصیات اور اس کے انفرادی حالات کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ ان چیزوں کا لحاظ کیے بغیر کسی دعوت کی کامیابی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہی چیز ہے جس کی وجہ سے قرآن مجید مختلف اوقات میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا:

وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾

(بنی اسرائیل ۱۷:۱۰۶)

''اور قرآن کو تو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے اس لیے اتارا کہ تم اس کو لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر سناؤ اور ہم نے اس کو نہایت اہتمام سے اتارا ہے۔''

اسی طرح قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی دعوت میں بہت سی باتیں عربوں کے اُفتادِ مزاج کے لحاظ سے اختیار کی گئیں۔ مثلاً چونکہ وہ ضدی اور جھگڑالو (قَوْمًا لُّدًّا) تھے اس وجہ سے ان سے بحث و مناظرہ کا وہ طریقہ اختیار کیا گیا جو ایک جھگڑالو اور ضدی قوم کے لیے موزوں تھا۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیہات سے آنے والے لوگوں کے سامنے دین حق کو جس انداز سے پیش کرتے تھے وہ اس سے بالکل مختلف ہوا کرتا تھا جس انداز سے آپ مکہ اور مدینہ کے شہریوں کو دعوت دیتے تھے۔ وفدِ عبد القیس نے آپ سے شکایت کی کہ ہمارے اور آپ کے درمیان قریش کا قبیلہ حائل ہے اور ان کی دشمنی کی وجہ

سے اشہرِ حُرم کے سوا اور مہینوں میں ہم آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکتے، اس وجہ سے آپ ہمیں کچھ ایسی اصولی باتیں بتا دیجیے جنہیں ہم خود بھی اختیار کر سکیں اور ان کی دعوت دوسروں کو بھی دے سکیں۔ آپ نے ان کی ضرورت اور حالت کو سامنے رکھ کر صرف چار چیزوں کا حکم دیا اور چار چیزوں کی ممانعت فرمائی اور فرمایا کہ اپنی قوم کے لوگوں کو ان چار چیزوں کا حکم دو اور ان چار چیزوں سے روکو۔ اس سے زیادہ تفصیل آپ نے ان کے سامنے نہیں رکھی۔

ظاہر ہے کہ طریق دعوت کا یہ فرق محض ان جماعتوں کی نفسیات کے اختلاف کی بنا پر تھا۔ جن کا اختلاف معمولی اور جن کی الجھنیں سادہ تھیں، ان کے سامنے دین کی سیدھی سادی تعلیمات پیش کر دی جاتی تھیں تا کہ وہ ان پر عمل کریں۔ اس کے برعکس جو لوگ گہری الجھنیں رکھتے تھے ان کے ذہنوں کو صاف کرنے کے لیے ایک مناسب ترتیب کے ساتھ لگاتار دعوت دی جاتی تھی۔

پانچواں اصول

جس طرح ایک دہقان کے لیے زمین کی تیاری اور موسم کی سازگاری کے بغیر بیج ڈال دینا جائز نہیں ہے اور جس طرح ایک طبیب کو مرض کے بحران کی حالت میں مریض کو دوا دینے سے احتراز کرنا چاہیے، اسی طرح ایک داعی حق کو ان تمام اوقات میں دعوت سے احتراز کرنا چاہیے جب مخاطب اعتراض اور نکتہ چینی کی طرف مائل ہو۔ نہ صرف اس حالت میں دعوت پیش کرنے سے احتراز ضروری ہے، بلکہ اس دعوت کو پیش کرنے کے بعد بھی مخاطب پر اعتراض و نکتہ چینی کا دورہ پڑ جائے تو داعی کو چاہیے کہ بحث کو بڑھانے کی بجائے اس کو وہیں ختم کر کے وہاں سے ہٹ جائے اور کسی اور مناسب موقعہ کا انتظار کرے، جب مخاطب خالی الذہن یا کم از کم اعتراض و نکتہ چینی کے رجحان سے خالی ہو:

وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی

يَخُوْضُوْا فِىْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۚ وَ اِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٦٨﴾ (الانعام ٦:٦٨)

''اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں مین میکھ نکالتے ہیں تو ان سے کنارہ کش ہو جاؤ یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مصروف ہو جائیں۔ اور اگر شیطان تمہیں بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ان ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو۔''

اس صریح ممانعت کے ہوتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے علماء نے تبلیغ دین کے لیے مناظرہ کے طریقے کو کیسے جائز سمجھا، جس میں دونوں فریق اکٹھے ہی اس مقصد سے ہوتے ہیں کہ اپنے حریف کی بات کی تردید و تکذیب کریں گے۔ اگر چہ وہ حق ہی کیوں نہ ہو۔ جن لوگوں کو مناظرہ کی مجالس کا کچھ تجربہ ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان مجالس سے صرف اس خوض (موشگافی) کے شوق کو شہ ملتی ہے جس کی نسبت قرآن مجید نے حکم دیا ہے کہ اس کی بو محسوس کرتے ہی داعی حق کو دامن جھاڑ کے اٹھ جانا چاہیے۔ لیکن ہمارے مناظرین کو یہ بو اس قدر مرغوب رہی ہے کہ جس قدر یہ بڑھی اسی قدر ان کے ذوق وشوق میں اضافہ ہوا۔

چھٹا اصول

اسی طرح اُن مواقع سے بھی داعی کو احتراز کرنا چاہیے جب مخاطب اپنی کسی ایسی دلچسپی میں منہمک ہو جس کو چھوڑ کر دعوت حق کی طرف متوجہ ہونا اس کی طبیعت پر گراں گزرے۔ اگر چہ یہ حالت پہلی حالت سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس میں عناد و اختلاف کا جذبہ شامل نہیں ہے، لیکن مخاطب کی طبیعت کی عدم مستعدی کے اعتبار سے دونوں حالتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے:

عن عكرمة، عن ابن عباس، قال: حدّث النّاسَ كل جمعة مرّة۔ فان ابيت فمرّتين۔ فان اكثرت فثلاث۔ ولا تملّ النّاس هذا القران۔ والا الفينك تاتى القوم وهم فى حديث من

حدیثھم فتقص علیھم فتملّھم۔ ولکن الصتَ فاذا امروک فحدثھم وھو یشتھونہ[1]

''عکرمہ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے کہا کہ لوگوں کو جمعہ جمعہ وعظ کیا کرو۔ اگر اس سے زیادہ ہو تو ہفتہ میں دو بار۔ اگر اس سے بھی زیادہ کرنا چاہو تو تین بار۔ اور لوگوں کو اس قرآن سے بیزار نہ کرو اور تمہیں اس حال میں نہ دیکھوں کہ تم کسی جماعت کے پاس اور وہ اپنے کسی اور کام میں مشغول ہوں۔ اور اسی حال میں تم ان کو اپنا وعظ سنانا شروع کر دو اور اس کا نتیجہ بیزاری ہو بلکہ تمہیں چاہیے کہ تم خاموش رہو اور جب لوگ فرمائش کریں تو ان کو سناؤ اور وہ خواہش سے سنیں۔''

ساتواں اصول:

داعی کے لیے اس امر کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ دعوت کی خشکی و یک رنگی، اس کی بے ضرورت تکرار، اور اس کے بے فائدہ طولِ بیان سے سننے والے بدخط اور بیزار نہ ہونے پائیں:

عن ابی وائل، قال: کان عبد اللّٰہ یُذکّر النّاسَ فی کل خمیس۔ فقال لہ رجل: یا ابا عبد الرّحمٰنَ! لوددتُ انک ذکّرتنا کلّ یوم۔ قال: اما انہ یمنعنی من ذٰلک انی اکرہ ان اھلکم وانی اتخوّلکم بالموعظۃ کما کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یتخوّلنا بھا مخافۃ اسّامۃ علینا۔[2]

''ابووائل سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہر جمعرات کو وعظ کیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے ان سے کہا: اے ابوعبدالرحمٰن! (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی کنیت ہے) میری خواہش ہے کہ آپ روزانہ وعظ فرمایا کریں۔ انہوں نے جواب دیا: میں ایسا صرف اس

---

[1] صحیح البخاری: کتاب الدعوات، باب مایکرہ من السجع فی الدّعآء

[2] صحیح البخاری: کتاب العلم، باب من جعل لاھل العلم ایّاماً معلومۃ

خیال سے نہیں کرتا کہ کہیں تم بیزار نہ ہو جاؤ۔ میں بھی اسی طرح ناغہ کر کے تمہیں نصیحت کرتا ہوں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ناغہ کر کے نصیحت کیا کرتے تھے تا کہ ہم بیزار نہ ہونے پائیں۔"

یہ سطریں لکھتے وقت ہمارے سامنے اُن واعظین اور اُن کے بدقسمت اور مظلوم سامعین کی ایک تصویر آ گئی ہے جن کی وعظ گوئی کا سب سے بڑا ہنر ان کا لایعنی طولِ کلام ہوتا ہے جو اتنی موٹی سی بات سے بھی واقف نہیں ہیں کہ بہتر سے بہتر بات بھی بے ضرورت بار بار دہرانے سے ناگوار بن جایا کرتی ہے اور وعظ سنانے کے لیے لوگوں کے پیچھے پڑ جانے سے نہ صرف یہ کہ دعوت دین کے مقصد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، بلکہ الٹا اس سے شدید نقصان پہنچتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم لوگوں کو وقفہ وقفہ کے ساتھ نصیحت فرمایا کرتے تھے تا کہ لوگ اکتا نہ نہ پائیں۔ آپ کے خطبے نہایت مختصر ہوا کرتے تھے۔ نیز روایات میں آتا ہے کہ آپ کی ہدایت تھی کہ "جب نصیحت کرو تو مختصر نصیحت کرو"۔ اور بعض روایات میں خطبہ کے اختصار کو خطیب کی دانش مندی کی علامت قرار دیتے ہوئے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "بعض خطبے جادو ہوتے ہیں" یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خطبے مختصر اور جامع و بلیغ ہونے چاہیں کہ جادو کی طرح دلوں پر اثر کریں، نہ کہ سننے والے کی طبیعت کو کند کر دیں کہ اس میں کسی بات کو سننے اور اس کو قبول کرنے کی کوئی صلاحیت ہی باقی نہ رہ جائے۔

آٹھواں اصول

ایک داعی حق کو اپنے گرد و پیش کا پوری ہوشیاری و مستعدی کے ساتھ جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ دعوت کی تخم ریزی کے لیے کب کوئی موزوں موقع ہاتھ آتا ہے۔ جونہی وہ محسوس کرے کہ اس کے مقصد کے لیے کوئی موقع پیدا ہو گیا ہے، بغیر کسی توقف کے، اسے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کی بہترین مثال حضرت یوسف علیہ السلام

کے اُسوہ میں ملتی ہے:

وَ دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۭ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ
خَمْرًا ۚ وَ قَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ
الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝٣٦ قَالَ لَا
يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ۭ
ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ۭ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ
هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝٣٧ وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ
اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ
مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا
يَشْكُرُوْنَ ۝٣٨ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ
الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝٣٩ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ
اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا
لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝٤٠ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ
خَمْرًا ۚ وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ قُضِيَ
الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ۝٤١ (یوسف ۱۲: ۳۶-۴۱)

"اور اس کے ساتھ دو اور جوان بھی جیل خانہ میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا کہ میں اپنے کو دیکھتا ہوں کہ میں اپنے سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں جس میں سے چڑیاں کھا رہی ہیں۔ آپ ہمیں اس کی تعبیر بتایئے۔ ہم آپ کو خوب کاروں میں سے سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا: جو کھانا تمہیں ملتا ہے وہ آئے گا نہیں کہ میں اس کے آنے سے پہلے پہلے تمہیں اس کی تعبیر بتا دوں گا۔ یہ اس علم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھایا ہے۔ میں نے ان

لوگوں کے مذہب کو چھوڑا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت سے یہی لوگ منکر ہیں۔ اور میں نے اپنے بزرگوں، ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کے مذہب کی پیروی کی۔ ہمیں حق نہیں کہ ہم کسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھہرائیں۔ یہ اللہ کا ہم پر اور لوگوں پر فضل ہے، لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔ اے میرے جیل کے دونوں ساتھیو! کیا الگ الگ بہت سے رب بہتر ہیں، یا اکیلا اللہ ہی سب پر حاوی و غالب؟ تم اس کے سوا نہیں پوجتے مگر چند ناموں کو جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ چھوڑے ہیں۔ اللہ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ اختیار و اقتدار صرف اللہ ہی کا ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو۔ یہی دین قیم ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اے میرے زنداں کے دونوں ساتھیو! تم میں سے ایک تو اپنے آقا کو شراب پلانے کی خدمت انجام دے گا۔ رہا دوسرا تو اس کو سولی دی جائے گی، پھر پرندے اس کے سر کو نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ اس امر کا فیصلہ ہوا جس کے بارے میں تم پوچھ رہے تھے۔"

اس پر ایک نظر ڈال کر واقعہ کی پوری تصویر چشم تصور کے سامنے لائیے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو آدمی جیل میں داخل ہوتے ہیں۔ دونوں خواب دیکھتے ہیں۔ انہیں خواب کی تعبیر معلوم کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ قید خانہ کے آدمیوں میں ہر اعتبار سے حضرت یوسف علیہ السلام ہی ایسے آدمی ان کو نظر آتے ہیں جن کی طرف اس غرض کے لیے وہ رجوع کر سکتے ہیں۔ چنانچہ حُسنِ عقیدت و احترام کے جذبہ کے ساتھ، اپنے خواب وہ ان کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام اس موقعہ پر یہ نہیں کرتے کہ انہیں خواب کی تعبیر بتا کر رخصت کر دیں یا ان کے جذبہ عقیدت سے فائدہ اٹھا کر ان پر اپنی شخصیت و بزرگی کا رعب جمانے کی کوشش کریں اور اس سے کوئی ذاتی فائدہ حاصل کرنا چاہیں، بلکہ وہ ان کے اس التفات کو غنیمت سمجھ کر وہ دعوت ان کے سامنے پیش کر دیتے ہیں جو ان کے دل سے لگی ہوتی ہے:

امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دل دوستاں رہے نہ رہے

اور پیش کرنے کا انداز ایسا اختیار فرماتے ہیں کہ گویا سلسلہ سخن میں بات میں پیدا ہو گئی ہے، نہ کہ قصد کر کے ایک بات کے کہنے کے لیے موقع پیدا کیا گیا ہے، اس سے ایک اہم حقیقت تو یہ سامنے آئی کہ جس طرح ایک کسان تخم ریزی کے لیے، گھات لگائے بارش کا انتظار کرتا ہے، اسی طرح ایک داعی حق کو بھی اپنے گرد و پیش پر نظر رکھنی چاہیے کہ کب کس کے دل کے اندر اس کے لیے وہ التفات پیدا ہوتا ہے جو اس کی دعوت کی تخم ریزی کے لیے فصل و موسم کا کام دے سکتا ہے۔ اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جب اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے کوئی اس طرح کا موقع میسر آ جائے تو نہ تو اس کو ضائع کرنا جائز ہے اور نہ اس اعلیٰ مقصد کے سوا کسی اور غرض کے لیے اس کو استعمال کرنا جائز ہے۔ اس طرح کے مواقع جب خودغرض لوگوں کو ملتے ہیں تو وہ بجائے اس کے کہ ان کو دعوت حق کے لیے استعمال کریں، اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کو اپنے ذاتی اغراض کے حصول کا ذریعہ بنائیں۔ اس زمانہ میں عام طور پر ہمارے علماء و مشائخ اس بیماری میں مبتلا ہیں۔ وہ جب اپنی طرف کسی دل کو ملتفت پاتے ہیں تو اس کو دیکھ کر خوش تو بہت ہوتے ہیں، لیکن ان کی خوشی اس طرح کی نہیں ہوتی جس طرح کی خوشی حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھیوں کے التفات سے ہوئی تھی۔ بلکہ یہ خوشی اس مکڑی کی خوشی کی طرح ہوتی ہے جو اپنے اردگرد جالا تن کر مکھیوں کے انتظار میں بیٹھتی ہے اور جب کسی مکھی کو پاس آتے دیکھتی ہے تو جوشِ نشاط سے ناچنے لگتی ہے کہ ایک فربہ شکار ہاتھ آیا۔

نواں اصول

ہر داعی حق کے لیے بحث و استدلال میں مخاطب کے درجہ اور حیثیت کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ مثلاً اہل علم سے جو خطاب ہو گا وہ جس انداز اور لب و لہجہ میں ہو گا وہ اس انداز اور لب و لہجہ سے بالکل مختلف ہو گا جو عوام کے لیے اختیار کیا جائے گا۔ ایک داعی حق کے لیے محض اس بنیاد پر کہ پوری سچائی صرف اسی کے ساتھ ہے، یہ بات جائز نہیں ہو سکتی ہے کہ وہ

دوسری جماعتوں کو جن کے پاس پوری سچائی نہیں ہے، ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا شروع کر دے۔ بلکہ اس کو چاہیے کہ ان کو ٹھیک ٹھیک تول کر ان کے درجہ اور مرتبہ کے لحاظ سے ان کی جگہوں پر رکھے اور ہر ایک کی حیثیت کا لحاظ کر کے اس کے سامنے دعوت کو پیش کرے۔ مثلاً اہل کتاب کے سامنے دعوت پیش کرنے کے متعلق قرآن مجید نے یہ ہدایت فرمائی ہے:

وَ لَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ اِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (العنکبوت ۲۹:۴۶)

''اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر اس طریقہ پر جو بہتر ہے بجز ان کے جو ان میں سے ظالم ہیں اور کہو کہ ہم ایمان لائے اس چیز پر جو ہم پر نازل ہوئی اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف اتاری گئی اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اس کی فرماں برداری کرنے والے ہیں۔''

یہاں جس احسن طریقہ سے اہلِ کتاب سے مباحثہ کرنے کی اجازت دی ہے اس کی صورت بھی بیان کر دی ہے کہ وہ جن پہلوؤں سے تمہارے ہم رتبہ ہیں یا جو امور ان کے اور تمہارے درمیان مشترک ہیں، ان کا اقرار کرو تا کہ ان کے اور تمہارے درمیان نفرت کے بجائے موانست اور دوری کے بجائے قرب پیدا ہو اور اس کے بعد ان سے مطالبہ کرو کہ ان مسلمات سے جو باتیں لازم آتی ہیں ان میں بھی وہ تمہارے ساتھ متفق ہو جائیں۔ اس طریق دعوت کا نفسیاتی اثر مخاطب پر یہ ہوگا کہ وہ یہ دیکھ کر داعی نہ اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھ رہا ہے اور نہ اپنی دعوت کو کسی نئے اکتشاف کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے، بلکہ اس دعوت میں جتنا حصہ مخاطب کا ہے اس کا صاف لفظوں میں اقرار کر رہا ہے، وہ اس پر غور کرنے کی طرف مائل ہوگا اور اگر وہ کھلا ہوا معاند اور ہٹ دھرم نہ ہوگا تو اس کو قبول بھی کرے گا۔ اور اگر ایسا نہ کیا جائے، بلکہ اہلِ علم اور اہلِ کتاب کو بھی اسی طرح خطاب کیا جائے جس طرح اُمیوں کو خطاب کیا جا سکتا ہے تو قدرتی طور پر ان لوگوں کا پندار مجروح ہوگا

جو داعی ہی کی طرح علم اور کتاب کے مدعی ہیں اور یہ چیز قبول دعوت کی راہ میں شدید مزاحمت پیدا کرے گی۔

دسواں اصول

داعی حق اگر مخاطب کے اندر عناد اور ہٹ دھرمی کی بو محسوس کرے تو اپنی طرف سے ہرگز اس بات کا موقع نہ دے کہ اس کا یہ مرض مزید ابھرے، بلکہ اس سے بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ یہاں تک کہ اگر وہ داعی کی کسی دلیل پر ایسا معارضہ کر بیٹھے جو بالکل کھلی ہوئی دھاندلی ہو، جب بھی اس دلیل کے پیچھے پڑنے اور اس پر ردوکد کے بجائے اس کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس کے سامنے امرِ حق کسی ایسے پہلو سے پیش کیا جائے جس پر اس کو اپنی ہٹ دھرمی کے اظہار کا موقعہ نہ ملے۔ بلکہ اگر اس میں قبول حق کی صلاحیت ہو تو اس کو قبول کرلے اور اگر نرا معاند ہی ہو تو کم از کم ہکا بکا ہو کے رہ جائے، اس کو بحث و جدال کی راہ نہ مل سکے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ایک بادشاہ کا مناظرہ قرآن مجید میں مذکور ہے، جو اس کی بہترین مثال ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھٖمَ فِیْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰھٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۟ۚ

(البقرۃ ۲:۲۵۸)

"کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے باب میں اس وجہ سے حجت کی کہ خدا نے اس کو اقتدار بخشا تھا، جب کہ ابراہیم نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے، وہ بولا کہ میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا کہ یہ بات ہے تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو اسے پچھم سے نکال دے، تو وہ کافر یہ سن کر بھونچکا رہ

گیا اور اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دلیل پیش کی تھی وہ معترض کے معارضہ سے ذرا بھی مجروح نہیں ہوئی تھی۔ وہ چاہتے تو اس پر بہت کچھ فرما سکتے تھے، لیکن مخاطب کی نفسیات کا اندازہ کر لینے کے بعد اگر وہ اس پر مزید اصرار فرماتے تو یہ چیز اس طریقے کے بالکل خلاف ہوتی جس کی تلقین قرآن نے فرمائی ہے کہ:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ط (النحل ١٦:١٢٥)

"اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور ان کے ساتھ اس طریقہ سے بحث کرو جو پسندیدہ ہے۔"

باب ۱۰

انبیائے کرام کا طریقِ تربیت

کوئی دعوت حق دنیا میں مثمر اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی جب تک اس کے ساتھ ایک تدریجی اور مستقل پروگرام تربیت کا نہ ہو۔ اس چیز کے لیے یوں تو ہر دعوت وتحریک کی فطرت تقاضا کرتی ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ ایک دعوت حق کا تو یہ ایسا لازمی جزو ہے کہ اس کے بغیر اس کا کوئی تصور کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ، جیسا کہ پچھلے ابواب سے معلوم ہو چکا ہے، زندگی کے کسی ایک ہی گوشہ کو متاثر نہیں کرتی، بلکہ اس کے تمام ظاہر و باطن کو ایک نیا جلوہ دیتی ہے، اور صرف کسی جزوی تبدیلی ہی کا مطالبہ لے کر نہیں اٹھتی، بلکہ ہماری ساری انفرادی واجتماعی زندگی کے لیے ایک بالکل نیا سانچہ اور نئی سکیم پیش کرتی ہے۔ اس وجہ سے یہ اس کے عین مزاج ہی کا تقاضا ہے کہ جس تدریج و ترتیب کے ساتھ خود آگے بڑھتی ہے اسی ترتیب و تدریج کے ساتھ اس کے بالکل متوازی ایک تربیت کا پروگرام بھی ہوتا ہے جو اہمیت میں کسی طرح بھی اصل دعوت سے کم نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ تربیت کی اہمیت اصل دعوت سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے تو شاید یہ مبالغہ نہ ہو۔ کیونکہ یہ تربیت ہی ہے جس کی وجہ سے کوئی دعوت دلوں میں جڑ پکڑتی ہے، پھر نشوونما پاتی ہے، پھر برگ و بالا لاتی ہے، یہاں تک کہ ایک دن اپنے فوائد و برکات سے معاشرے کو مالا مال کر دیتی ہے۔

ایک داعی حق کے کام کی صحیح مثال ایک دہقان کے کام سے دی جا سکتی ہے۔ جس طرح اس کا مقصد صرف اتنی سی بات سے حاصل نہیں ہو سکتا کہ کچھ بیج کسی زمین میں ڈال کر فارغ ہو بیٹھے اسی طرح ایک داعی حق کا کام بھی صرف اتنے سے انجام نہیں پا سکتا کہ وہ لوگوں کو

کچھ وعظ سنا کر سو رہے۔ بلکہ اس کے مقصد کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر اپنی پھیلائی ہوئی دعوت کے ساتھ وہی لگاؤ ہو جو ایک فرض شناس کسان کو اپنے بوئے ہوئے بیج کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس طرح کسان نگرانی کرتا ہے کہ بیج زمین میں جڑ پکڑے، اس کو صحیح وقت پر پانی ملے، موسم کی ناسازگاریوں سے محفوظ رہے، صحیح طور پر نشوونما پائے، بے گانہ سبزے اس کی ترقی میں مزاحم نہ ہوں، فضا کے پرندوں اور زمین کے چرندوں کی تاخت سے وہ سلامت رہے۔ اور جب ایک مدت تک اس دُھن میں اپنے دن کے اطمینان اور رات کے سکون کو وہ درہم برہم رکھتا ہے، لگاتار محنت اور مسلسل نگہداشت کرتا ہے، تب جا کر کہیں اپنی محنت کا پھل پاتا ہے۔ اسی طرح ایک داعی حق کو بھی اسی صورت میں اپنی دعوت کو پھولتے پھلتے دیکھنا نصیب ہوتا ہے جب وہ دعوت کے ساتھ ساتھ تربیت کی جانکاہیوں کے ایک طویل سلسلہ کو جھیلنے کی قابلیت اور ہمت رکھتا ہو۔ ورنہ جس طرح ایک غافل کسان کے بوئے ہوئے بیج زمین اور موسم کی بے مہریوں اور چرند و پرند کی ترکتازیوں کی نذر ہو جاتے ہیں، اسی طرح ایک داعی کی دعوت بھی صدا بصحرا ہو کے رہ جاتی ہے۔

جماعتی تربیت کے پانچ اصول

انبیاء علیہم السلام کے طریق دعوت و تربیت پر غور کرنے سے جماعتی تربیت کے لیے جو اصول مستنبط ہوتے ہیں ان میں سے بعض اہم چیزوں کو ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

پہلا اصول

جماعتی تربیت کا سب سے پہلا اور سب سے اہم اصول یہ ہے کہ داعی کی تعلیم و دعوت کے کام میں جلد بازی سے احتراز کرنا چاہیے۔ اس کو یہ برابر دیکھتے رہنا چاہیے کہ تعلیم کی جو خوراک اس نے دی ہے وہ اچھی طرح ہضم ہو کر لوگوں کے فکر و عمل کا جزو بن گئی ہے یا نہیں۔ اس کا پورا پورا اندازہ کیے بغیر اگر مزید غذا دے دی گئی تو اس کا نتیجہ صرف فسادِ معدہ

اور سوء ہضم کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ جن لوگوں نے داعیانِ حق کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات سے ناواقف نہیں ہیں کہ ہر داعی حق سے معاملہ دعوت میں جلد بازی کے لیے دو طرفہ مطالبہ ہوتا ہے۔ جو لوگ دعوت کو قبول کر چکے ہوتے ہیں وہ حق کی لذت سے ابھی نئے نئے آشنا ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ نئی نئی آشنائی ان میں حق کا ایسا شوق پیدا کر دیتی ہے کہ تدریج و ترتیب کا پروگرام ان پر بہت شاق گزرتا ہے۔ وہ حق کی حرص میں اس طرح مبتلا ہو جاتے ہیں کہ نہ تو اپنی بھوک اور قوت ہضم کا صحیح اندازہ کر پاتے، نہ جماعت کے دوسرے کمزوروں کی کمزوری کا لحاظ کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بھی اپنی اصلی حیثیت سے زیادہ تولتے ہیں اور اپنے کمزور ساتھیوں کو بھی ان کی استعداد سے زیادہ قیاس کرتے ہیں۔ اس کے سبب سے ان کی طرف سے برابر "هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ" کا مطالبہ رہتا ہے۔ ان کے ماسوا دوسرے لوگ جو بھی دعوت کے مخالف ہوتے ہیں وہ دعوت کے کمزور پہلوؤں کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ وہ اگر اس کے پیش کردہ پروگرام میں حرف گیری کی کوئی گنجائش نہیں پاتے تو یہی مطالبہ شروع کر دیتے ہیں کہ اپنا پورا پروگرام پیش کرو۔ ان کا مقصد محض یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی چیز ان کے مطالبہ کے جواب میں فوراً نہ پیش کی گئی تو وہ لوگوں پر یہ ظاہر کر سکیں گے کہ یہ محض ایک بے مقصد اور مجہول دعوت ہے۔ اس کے آگے نہ کوئی متعین منزلِ مقصود ہے نہ اس منزل تک پہنچنے کا کوئی واضح اور ٹھوس پروگرام ہے اور اگر کوئی چیز پیش کی گئی تو اس میں کوئی نہ کوئی رخنہ ڈھونڈ کر لوگوں کو دکھا سکیں گے اور اگر کوئی رخنہ تلاش کے باوجود بھی نہ مل سکا تو اس کو پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔

علاوہ ازیں ایک سچے داعی حق کے اندر تبلیغ حق کی ایک پرزور خواہش خود ہی دبی ہوئی ہوتی ہے جو اتنی قوی ہوتی ہے کہ اللہ کی بخشی ہوئی حکمت اگر اس کی نگرانی نہ کرے تو صبر و انتظار اور تدریج و ترتیب کے سارے حدود و قیود توڑ ڈالے۔ اس خواہش کو یہ دو طرفہ مطالبہ جب مشتعل کر دیتا ہے تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ داعی میانہ روی کی اس روش سے ہٹ جاتا ہے جو اس کے مقصد کی کامیابی اور جماعت کی صحیح تربیت کے لیے ضروری ہے۔ ہر چند

کی سچی محبت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے لیے آدمی میں ندیدوں کی سی بھوک ہو جو اسے مضطرب بھی رکھے، بے صبر بھی بنا دے اور جلد بازی پر بھی مجبور کر دے، لیکن جماعت کی تربیت کا مطالبہ حق کی قدر شناسی اور محبت کے مطالبہ سے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اس وجہ سے ایک داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان صحیح صحیح توازن قائم رکھے۔ اگر پہلی چیز کا تقاضا اس کو جلد بازی کے لیے بے چین کرے تو چاہیے کہ دوسری چیز کا مطالبہ اس کو انتظار پر مجبور کرے۔ اگر اعلان حق کا شوق اور حمایت حق کا جذبہ اس کو اکسائے کہ وہ اہل شوق کے شوق کو تشنہ چھوڑے نہ معاندین پر اتمامِ حجت میں کوئی کسر باقی رہنے دے تو چاہیے کہ تربیت کے اہتمام کے لیے وہ اس امر پر بھی نظر رکھے کہ کہیں شراب قدح خوار کے ظرف سے زیادہ نہ ہو جائے۔

جب کبھی ایسا ہوا کہ پہلا جذبہ اس قدر غالب آ گیا ہے کہ دوسرے پہلو کی پوری رعایت نہیں ہو سکی ہے تو جماعتی تربیت میں ایسا نقص رہ گیا ہے کہ بعد میں اس کی تلافی نہیں ہو سکی ہے، اسی رخنہ سے شیطان نے جماعت کے اندر گھس کر انڈے بچے دے دیے ہیں اور پھر اس کے پھیلائے ہوئے فتنوں کی لپیٹ میں پوری جماعت آ گئی۔ اس کی سب سے زیادہ عبرت انگیز مثال ہم کو بنی اسرائیل کی تاریخ میں ملتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے نکل کر سینا میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو احکامِ شریعت سے آگاہ کرنے کے لیے طور پر بلایا اور اس غرض کے لیے ایک خاص دن معین فرما دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس معین دن سے پہلے ہی طور پر پہنچ گئے۔ ان کے اندر اللہ کے احکام معلوم کرنے اور اس کی رضا طلبی کا جو جوش و جذبہ تھا اوّلاً تو وہ خود ہی اتنا قوی تھا کہ باریابی کا اشارہ پانے کے بعد وقت اور تاریخ کی پابندیاں اس پر شاق تھیں۔ ثانیاً قوم کی طرف سے ہر قدم پر جو مطالبے پر مطالبے ہو رہے تھے اس سے بھی اس جذبہ کو تحریک ہوئی ہوگی۔ اگرچہ یہ جذبہ نہایت اعلیٰ اور محمود جذبہ تھا اور طور پر معین وقت سے پہلے پہنچ جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اللہ کے احکام معلوم کرنے کے لیے نہایت بے چین اور مضطرب دل رکھتے ہیں، لیکن اس معاملہ کا

ایک دوسرا قابل اعتراض پہلو بھی تھا، جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نظر نہیں گئی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فوراً بلانے کی بجائے ان کے لیے جو ایک خاص وقت مقرر کیا تو اس سے منشائے الٰہی یہ تھا کہ یہ وقفہ وہ قوم کی تربیت میں صرف کریں اور جن اصولی باتوں کی قوم کو تعلیم دی جا چکی ہے اس کو اچھی طرح ان کے اندر پختہ کریں تاکہ آزمائشوں اور فتنوں میں پڑنے کے بعد بھی وہ ایمان و اسلام کو سلامت رکھ سکے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے مزید احکام معلوم کرنے کا شوق ان پر اس قدر غالب آ گیا کہ تربیت کی اہمیت کا احساس اس کے مقابل میں دب گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دین کے دشمنوں نے ان کی اس غیر حاضری اور قوم کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور قوم کے ایک بڑے حصے کو گوسالہ پرستی میں مبتلا کر دیا اور اس کی ساری ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عجلت پسندی پر ڈالی جو ہر چند تعلیم و دعوت ہی کی راہ میں تھی، لیکن بہرحال تربیت کی ذمہ داریوں سے غافل کرنے والی ثابت ہوئی۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کی اس عجلت اور اس کے انجام کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

وَ مَآ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ يٰمُوۡسٰى ﴿۸۳﴾ قَالَ هُمۡ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِىۡ وَ عَجِلۡتُ اِلَيۡكَ رَبِّ لِتَرۡضٰى ﴿۸۴﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ مِنۡۢ بَعۡدِكَ وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ ﴿۸۵﴾ (طٰہٰ ۲۰: ۸۳-۸۵)

"اور اے موسیٰ! یہ تم کو، اپنی قوم کو چھوڑ کر جلدی آنے پر کس نے ابھارا؟ اس نے کہا: وہ لوگ بھی میرے پیچھے ہی ہیں، اور میں، اے میرے رب! تیری خوشنودی کے لیے جلدی چلا آیا ہوں۔ فرمایا تو ہم نے تمہاری قوم کو تمہارے پیچھے ایک فتنہ میں ڈال دیا اور سامری نے ان کو گمراہ کر ڈالا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ایک داعی کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کے احکام و قوانین سے آگاہ کرے اسی طرح اس کا یہ بھی فرض ہے کہ پورے اہتمام کے ساتھ لوگوں کی تربیت کرے تاکہ اس کی تعلیم لوگوں کے فکر و عمل کے اندر اس طرح راسخ ہو جائے کہ سخت

سے سخت آزمائش میں بھی ان پر اس کی گرفت قائم رہ سکے۔ جو داعی صرف تعلیم کے پہلو پر نظر رکھتا ہے اور اس چیز کا شوق اس پر اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ تربیت کے لیے جو صبر و انتظار مطلوب ہے اس کا حق ادا نہیں کر سکتا، اس کی مثال اس جلد باز فاتح کی ہے جو اپنے اقتدار کے استحکام کی فکر کیے بغیر مارچ کرتا ہوا بڑھا چلا جا رہا ہے۔ اس طرح کی جلد بازی کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ایک طرف وہ فتح کرتا ہوا آگے بڑھے گا، دوسری طرف اس کے مفتوحہ علاقہ میں جنگل کی آگ کی طرح بغاوت پھیلے گی۔

سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی اس سبق آموز مثال کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عجلت پر گرفت فرمائی ہے جو آپ کے اندر احکام الٰہی معلوم کرنے کے لیے تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے فطری شوقِ علم اور قوم کی جلد بازی کی وجہ سے چاہتے تھے کہ وحی الٰہی جلد جلد نازل ہو تا کہ آپ اپنے شوقِ علم کو بھی تسلی دے سکیں اور قوم کے مطالبہ کو بھی پورا کر سکیں، چنانچہ اسی شوق کی وجہ سے جب وحی الٰہی اترتی، آپ ایک پرشوق طالب کی طرح اس کے سیکھنے میں جلد بازی فرماتے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس بات پر متعدد جگہ آپ کو ٹوکا کہ وحی الٰہی کی تکمیل کے لیے مدت مقرر ہے اس سے پہلے پورے قرآن کے اتار دیے جانے کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ یہ وقفہ اور انتظار تمہارے دل کو مضبوط کرنے اور تمہاری قوم کی تربیت کے لیے ہے تا کہ جو کچھ تمہیں سکھایا جا رہا ہے اس کو تم بھی برداشت کر سکو اور تمہاری قوم بھی اس میں اچھی طرح پختہ ہو جائے۔

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿١١٤﴾ وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿١١٥﴾ (طٰہٰ ۲۰: ۱۱۴-۱۱۵)

”پس تم قرآن کے لیے، اپنی طرف اس کی وحی پوری کیے جانے سے پہلے جلدی نہ کرو۔ اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب! میرے علم میں افزونی فرما۔ اور ہم نے اس سے پہلے آدم پر ایک عہد کی ذمہ داری ڈالی تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم کی پختگی نہیں پائی۔“

اس آیت کے آخر میں جلد بازی سے بچنے اور تربیت کی اہمیت بھی واضح فرما دی ہے کہ انسان میں یہ فطری کمزوری ہے کہ رغبات اور خواہشوں کے مقابل میں اس کا ارادہ کمزور پڑ جایا کرتا ہے، اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس پر جو ذمہ داری ڈالی جائے اس کا پورا شعور پیدا کرنے کے لیے اس کی اچھی تربیت بھی کی جائے تاکہ وہ آزمائشوں کے مقابل میں اپنے آپ کو ثابت قدم رکھ سکے۔

اسی تربیت کے تقاضے سے قرآن مجید تھوڑا تھوڑا کر کے اترتا تو جلد باز مخالفین اعتراض کرتے کہ اگر یہ اللہ کی کتاب ہے تو جستہ جستہ کیوں اتر رہی ہے؟ خدا کا علم تو حاضر و مستقبل سب کو گھیرے ہوئے ہے، اس کو تو نہ سوچنے کی ضرورت ہے نہ تجربہ کرنے کی اور نہ کسی مصلحت پر نظر رکھنے کی، پھر آخر وہ پوری کتاب ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اتار دیتا؟ یہ تو صاف اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اپنی تصنیف ہے، غور و فکر اور محنت و تجربہ کے بعد جتنی کچھ تیار کر پاتے ہیں اس کو پیش کرتے ہیں۔ قدرتی طور پر اس اعتراض کا اثر بہت سے مسلمانوں پر بھی ہوا اور یہ بات خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر بھی گراں گزری، لیکن اللہ تعالیٰ نے نہ تو مخالفین کی جلد بازی ہی کی حوصلہ افزائی فرمائی اور نہ اس خلش ہی کو کچھ اہمیت دی جو نکتہ چینوں کے اس اعتراض اور فطری شوق علم کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کے دل میں پیدا ہوتی تھی۔ بلکہ فرمایا کہ تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی تربیت کا تقاضا یہی ہے کہ ہمارے احکام تھوڑے تھوڑے کر کے ایک تدریج کے ساتھ اتریں تاکہ تمہارا دل بھی ان کے تحمل کے لیے پوری طرح مضبوط ہو جائے اور جماعت کے قوی اور ضعیف بھی ان کو اچھی طرح اپنا لیں۔ اگر جلد بازی کرو گے تو تمہاری امت میں کمزری رہ جائے گی اور جس طرح سامری نے بنی اسرائیل کو گمراہی میں ڈال دیا اسی طرح کوئی سامری تمہاری امت میں پیدا ہو کر اس کو گمراہی میں مبتلا کر دے گا۔

جو تدریج قرآن کے نزول میں ہم پاتے ہیں بعینہٖ وہی تدریج صحابہ اور بعد کے لوگوں

نے اس کے سیکھنے اور سکھانے میں ملحوظ رکھی، اس کی مصلحت بھی بعینہٖ وہی تھی کہ جو لوگ اس کو سیکھیں اس طرح سیکھیں کہ یہ ان کے ذہن و دماغ کے اندر بھی پیوست ہو جائے اور ان کی عملی زندگی بھی بالکل اس کے رنگ میں رنگ جائے۔ یہ بات صرف اس صورت میں ممکن تھی کہ اس کی تعلیم ایک تدریج کے ساتھ آہستہ آہستہ لوگوں کو دی جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس علم کے مطابق ان کی تربیت بھی کی جائے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ:

قَالَ کان الرّجل منّا اذا تعلّم عشر اٰیات لَمْ یجاوزھن حتّٰی یعلم معانیھن و العمل بھنّ [1]

دوسرا اصول

جماعتی تربیت کا دوسرا اصول یہ ہے کہ داعی کمیت سے زیادہ کیفیت پر نظر رکھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ داعی پر ''کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش'' کا شوق اس قدر غالب ہو جایا کرتا ہے کہ وہ گلہ کی بھیڑوں سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس غفلت کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ تو کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں میدانوں اور جنگلوں کی خاک چھانتا پھر رہا ہوتا ہے اور ادھر گلہ کی بھیڑیں یا تو بھوکوں مرنے لگ جاتی ہیں یا کوئی بھیڑیا باڑے کے اندر گھس کر ان کو چیر پھاڑ ڈالتا ہے۔ اپنوں سے یہ بے پروائی اور بے گانوں کو اپنانے کی یہ خواہش داعیان حق کے اندر نہایت نیک جذبہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ان پر دعوت کا جوش اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ تربیت کے فرض کا احساس اس کے مقابل میں یا تو دب جاتا ہے یا کم از کم پیچھے پڑ جاتا ہے۔ وہ اس بات کو زیادہ اہمیت دینے لگ جاتے ہیں کہ جو اللہ کے باغی اور نافرمان ہیں وہ پہلے اللہ کا نام لینے والے بن جائیں، رہی ان کی تربیت و اصلاح تو یہ چیز بعد میں ہوتی رہے گی۔ بظاہر تو یہ ایک نیک خیال ہے، لیکن اگر اس کی تہ میں غور کیا جائے تو یہی اصل ہے

[1] البرھان فی علوم القرآن للزرکشی۔ ۲: ص۱۵۷

کیفیت کے مقابل میں کمیت کو ترجیح دینے کی۔ اور پھر آگے چل کر اسی سے یہ غلط نقطہ نظر پیدا ہو جاتا ہے کہ لوگ دلوں کی جگہ سروں کی تعداد گن کر پوری طرح مطمئن ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس غلطی سے بچانے کے لیے داعیان حق کو یہ تعلیم دی ہے کہ جو لوگ دعوت سے بے گانہ ہیں ان کو پکارنے اور اپنانے کی خواہش اتنی غالب نہ ہونی چاہیے کہ اس انہماک میں ان غریبوں کا حق مارا جائے جو بے چارے دعوت قبول کر کے تربیت و تزکیہ کے لیے منتظر بھی ہیں اور اس کے محتاج بھی ہیں:

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٨٨﴾ (الحجر ۱۵:۸۸)

''ہم نے ان کے مختلف گروہوں کو جن چیزوں سے بہرہ مند کر رکھا ہے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو اور نہ ان کی حالت پر غم کرو اور اپنی شفقت کے بازو اہل ایمان پر جھکائے رکھو۔''

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ ۖ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ (الکہف ۱۸:۲۸)

''اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جمائے رکھو جو صبح و شام اپنے رب کی رضا جوئی میں اس کو پکارتے ہیں۔ اور تمہاری نگاہیں حیاتِ دنیا کی زینتوں کی خاطر ان سے ہٹنے نہ پائیں۔''

عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ ﴿١﴾ أَن جَاءَهُ الْأَعْمَىٰ ﴿٢﴾ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ ﴿٣﴾ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰ ﴿٤﴾ أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ ﴿٥﴾ فَأَنتَ لَهُ تَصَدَّىٰ ﴿٦﴾ (عبس ۸۰:۱-۶)

''اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ آیا اس کے پاس نابینا اور تمہیں کیا معلوم شاید وہ اپنی اصلاح کرتا یا نصیحت سنتا تو نصیحت اس کو نفع پہنچاتی! جو بے پروائی برتتا ہے اس کے تو تم

پیچھے پڑتے ہو۔"

ان تمام آیات میں داعی کو اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ جو لوگ دعوت قبول کر چکے ہیں اگر چہ وہ بظاہر تعداد کے لحاظ سے کم اور حیثیت کے لحاظ سے معمولی ہوں، لیکن ان کی تربیت میں جو وقت صرف ہونا چاہیے وہ ان لوگوں کے پیچھے نہ برباد کیا جائے جو اگر چہ شان وعظمت رکھتے ہیں اور ان کی اس شان وعظمت سے دعوت کو فائدہ پہنچنے کی بھی توقع ہوسکتی ہے، لیکن وہ گھمنڈ کے نشہ میں سرشار اور دعوت سے بیزار ہیں۔

تیسرا اصول

جماعتی تربیت کا تیسرا اصول یہ ہے کہ جماعت جن اصولوں پر بنی ہے جماعت کے کسی گوشہ میں ان سے انحراف یا بغاوت کی بیماری نہ پھیلنے دی جائے۔ اگر اس قسم کا کوئی فتنہ سر اٹھاتا نظر آئے تو جماعت کے رہنماؤں اور اربابِ کار کا فرض ہے کہ اس کے پھیلنے سے پہلے اس کے قلع قمع کی فکر کریں۔ اور اس فرض کی ادائیگی میں نہ مصلحت بینی مانع ہو نہ رواداری، نہ کسی کا خوف اور نہ کسی کی محبت۔ اس امر میں معمولی غفلت کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ظاہر ہوا کہ قوم کا ایک بڑا حصہ خدا پرستی کی جگہ گوسالہ پرستی میں مبتلا ہو گیا۔ اس قسم کے فتنوں کی سرکوبی کے لیے جماعت کے لیڈروں کو نہ صرف قوی دل ہونا چاہیے، بلکہ کچھ مضائقہ نہیں کہ اگر وہ سخت دل بھی ہوں تاکہ بالکل بے مروت ہو کر ان کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم کے اندر جب شرک کے فتنہ کے پھوٹ پڑنے کی اطلاع ہوئی تو طور سے واپس آکر انہوں نے سب سے پہلے ان لوگوں کو نہایت سختی سے ڈانٹا جو ان کی غیر موجودگی میں قوم کی نگرانی کے ذمہ دار تھے اور جن کی مروت یا رواداری کی وجہ سے اس خرابی کو پھیلنے کا موقع ملا۔ پھر انہوں نے اصلی مجرموں کو خود ان کے قبیلہ کے لوگوں کے ہاتھوں قتل کرادیا تاکہ ہر شخص پر یہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ جو لوگ جماعت کے اندر اس قسم کے فتنے پھیلائیں گے وہ ان لوگوں کی طرف سے بھی

کسی رحم و کرم یا رواداری کی امید نہیں کر سکتے جن کے ساتھ وہ خون اور نسب کی قریبی رشتے رکھتے ہوں گے۔ اس کے علاوہ اس بت کو بھی ریزہ ریزہ کر کے ناپید کر دیا جو سامری نے بنایا تھا تا کہ اس فتنہ کا کوئی ادنیٰ نشان بھی قوم میں باقی نہ رہے اور خود سامری کو تو ایسی عبرت انگیز سزا دی جو اس کے ساتھ زندگی بھر کے لیے چمٹ گئی۔

جماعت کو اس قسم کی خرابیوں سے پاس رکھنے کے لیے اسلام نے یہ قانون بنا دیا ہے کہ جب جماعت کے بعض افراد میں جماعتی اصولوں سے کوئی انحراف پایا جائے تو پوری جماعت کا فرض ہے کہ اس کی روک تھام اور اصلاح کے لیے کوشش کرے۔ اگر جماعت ایسا نہ کرے، بلکہ افراد کو چھوڑ دے کہ جو ان کے جی میں آئے کرتے رہیں تو ان کے جرم کا وبال صرف ان ہی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ جماعت کے فاسق اور متقی سب اس میں حصّہ پاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز کی حقیقت کشتی کی مثال دے کر سمجھائی ہے کہ اگر ایک کشتی کے مسافر اس شخص کا ہاتھ نہ پکڑیں جو کشتی کے پیندے میں سوراخ کر رہا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کشتی ڈوبے گی اور ایک شخص کی شرارت کی سزا سب کو بھگتنی پڑے گی۔ اسی طرح اگر ایک جماعت اپنے اندر کے شریروں سے رواداری برتتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوسکتا ہے کہ یہ شریر جو آفت ڈھائیں اس میں بلا استثناء پوری جماعت مبتلا ہو۔ قرآن مجید نے اس خطرہ سے ان الفاظ میں آگاہ فرمایا ہے:

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٢٥﴾ (الانفال ۸:۲۵)

"اور بچتے رہو اس فتنہ سے جو مخصوص طور پر انہی لوگوں کو نہیں لاحق ہوگا جنھوں نے جرم کا ارتکاب کیا ہوگا اور جان رکھو کہ اللہ سخت پاداش والا ہے۔"

اس فرض کو ادا کرنے کے لیے جماعت کے مختلف مدارج کے لحاظ سے طریق کار مختلف ہوگا، لیکن نفس فرض سے جماعت کسی حال میں بھی بری الذمہ نہیں ہوتی۔ ابتدائی مرحلہ میں جب جماعت کو کوئی سیاسی طاقت حاصل نہیں ہوتی، صرف جماعت کا مزاج ان لوگوں کو

اپنے اندر سے چھانٹ کر الگ کرتا رہتا ہے جو اس کے اصولوں سے انحراف کرتے ہیں۔ وہ اوّلاً تو ان لوگوں کو اپنے اندر جگہ ہی نہیں دیتی جو اس کے رنگ میں اچھی طرح رنگے ہوئے نہ ہوں اور اگر اس قسم کے خام لوگ اس کے اندر کسی طرح گھس بھی آتے ہیں تو جس طرح ایک سلیم المزاج آدمی کے معدہ کے اندر مکھی قرار نہیں پکڑتی اسی طرح اس قسم کے لوگ اس نظام کے اندر نہیں ٹکتے۔ اگر اس پہلے ہی مرحلہ میں کسی جماعت کا یہ حال ہو کہ اس کے اصولوں سے انحراف کرنے والے اس کے اندر آسانی سے پرورش پا سکتے ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس جماعت کا کوئی مزاج ہی نہیں بنا ہے اور وہ بہت جلد منتشر ہو کے رہے گی۔ دوسرے مرحلے میں، یعنی جب جماعت کو سیاسی طاقت حاصل ہو جاتی ہے، جماعت کا سیاسی ادارہ اس بات کی نگرانی کرتا ہے کہ اس کے اندر فاسد عناصر پیدا ہونے یا گھسنے نہ پائیں۔ وہ اس کی روک تھام کے لیے عام تبلیغی و تعلیمی وسائل کے ساتھ اگر ضرورت سمجھتا ہے تو طاقت کو بھی استعمال کرتا ہے۔ یہ سیاسی ادارہ اگر پوری فرض شناسی کے ساتھ اپنی ذمہ داری ادا کرتا رہے تو پوری جماعت ذمہ داری سے بری رہتی ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ یہ بگڑ جائے تو پوری جماعت کا فرض ہوتا ہے کہ اس کی اصلاح کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا علَم لے کر اٹھے اور جب تک اس کی اصلاح نہ کر لے چین کی نیند نہ سوئے۔ اس دعوت اصلاح کی حد قرآن مجید نے یہ معین کی ہے کہ داعیان اصلاح صرف صدائے اصلاح پر قانع نہ ہو جائیں، بلکہ مجرمین کے طرزِ عمل سے اظہار بیزاری کر کے ان کے جرائم سے اپنے آپ کو عملاً علیحدہ بھی کر لیں۔

چوتھا اصول

جماعتی تربیت کا چوتھا اصول یہ ہے کہ ابتدائے دعوت میں جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو تعلیم و دعوت کے اصل مرکز سے وابستہ رہنے کی تاکید بھی کی جائے اور اس کا سامان بھی بہم پہنچایا جائے۔ جس دور میں جماعت کا مزاج ابھی بن رہا ہو اس دور میں مناسب ماحول اور

اصل مرکز سے براہِ راست وابستگی، صحیح تربیت کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیزیں ہیں۔ اس دور میں اگر دونوں چیزوں سے غفلت کی جائے تو جماعت کے اندر ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں جو عقلی اور اخلاقی، دونوں پہلوؤں سے اتنے مضبوط ہوں کہ اپنے آپ کو بھی دعوت کے اصلی رنگ میں رنگ لیں اور دوسروں کو بھی اس رنگ میں رنگ سکیں۔ بلکہ اس کے برعکس بیشتر ایسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جن پر دعوت کا رنگ ایسا ہلکا ہوتا ہے کہ آزمائش کی ایک ہی بھٹی سے گزرنے کے بعد اڑ جاتا ہے۔ اس طرح کے لوگ نہ فہم کے اعتبار سے اتنے پختہ ہوتے ہیں کہ دوسروں کے اندر دعوت کا صحیح شعور پیدا کر سکیں، نہ سیرت کے لحاظ سے اتنے مضبوط ہوتے کہ ہر طرح کے موافق و ناموافق حالات کے اندر اس دعوت کو جاری رکھ سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک کوئی مؤثر شخصیت موجود ہوتی ہے، لوگوں کے اندر اس دعوت کا چرچا موجود رہتا ہے، لیکن جونہی وہ سامنے سے ہٹی سارا ہنگامہ سرد پڑ گیا۔ اسلام میں ہجرت کا جو حکم دیا گیا اس کے اندر جہاں اور بہت سی حکمتیں ہیں ایک بہت بڑی حکمت یہ بھی تھی کہ تمام مسلمان براہ راست حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے فائدہ اٹھا سکیں اور ایک سازگار ماحول میں رہ کر اسلام کا رنگ ان پر اچھی طرح چھا جائے۔ جہاں یہ بات ممکن نہ ہو کہ ہر شخص اصل مرکز تعلیم و دعوت سے براہ راست فائدہ اٹھا سکے وہاں دعوت اسلامی کا کم سے کم مطالبہ یہ ہے کہ ہر گروہ کے ذہن اور صالح اشخاص کی ٹولیاں مرکز کی تعلیم و دعوت سے استفادہ کے لیے نکلیں اور دین کا فہم حاصل کرنے کے بعد جب اپنی قوم میں لوٹیں تو ان کو دین سے باخبر کریں:

وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (التوبۃ ۹:۱۲۲)

''یہ تو نہ تھا کہ سب ہی مسلمان اٹھتے تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے گروہ میں سے کچھ کچھ لوگ نکلتے تاکہ دین میں بصیرت حاصل کرتے اور اپنی قوم کے لوگوں کو بھی آگاہ کرتے جب کہ وہ

ان کی طرف لوٹتے کہ وہ بھی احتیاط کرنے والے بنتے۔"

پانچواں اصول

جماعتی تربیت کا پانچواں اصول یہ ہے کہ جماعت کے سامنے آزمائش کے جو مواقع آئیں ان میں جماعت کی غلطیوں اور خامیوں پر پوری نظر رکھی جائے اور جب وہ آزمائش کا وقت گزر جائے، اطمینان کا سانس لینے کا موقع میسر آجائے تو ان میں سے ہر غلطی اور خامی پر بے رُو رعایت تنقید کی جائے اور عقلی کمزوریاں جن اعتقادی خامیوں کی غمازی کر رہی ہوں ان کو پوری وضاحت کے ساتھ کھول کر لوگوں کے سامنے رکھ دیا جائے۔ شروع میں اس تنقید کا خطاب عام ہونا چاہیے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اپنی اپنی جگہ پر ہر شخص اس تنقید سے متنبہ ہوگا اور اگر طبیعت میں صلاحیت ہوگی تو اس سے فائدہ بھی اٹھائے گا۔ پہلے ہی مرحلہ میں متعین طور پر صرف غلط کاروں کو نام بنام ملامت کرنے سے ان کو اپنی رسوائی کا احساس ہوتا ہے جس سے ان کے اندر اصلاحِ حال کے بجائے ضد اور ہٹ دھرمی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ البتہ جب کسی گروہ کے متعلق بار بار کے تجربہ کے بعد بھی یہی ثابت ہو کہ وہ جماعت کے اصولوں سے صرف کسی ذہنی الجھن کی وجہ سے یا محض اتفاقی طور پر انحراف نہیں کر رہا ہے، بلکہ قصد و ارادہ کے ساتھ اس نے منافقت ہی کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے تو اس کو براہ راست اس کی غلطیوں پر متنبہ کرنا چاہیے اور پردہ داری اور رواداری کا طریقہ بدل دینا چاہیے۔ اس گروہ کو یہ آخری تنبیہ ہوگی۔ اس کے بعد بھی اگر یہ گروہ اپنی اصلاح نہ کرے تو پھر جماعت کا فرض ہے کہ اس قسم کے لوگوں کو اپنے اندر سے بالکل کاٹ پھینکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کے ساتھ یہی طریقہ اختیار فرمایا، اور یہی طریقہ جماعتی تربیت کے لیے عقل و فطرت کے مطابق ہے۔ جو لوگ قرآن مجید پر نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اسلام کی تاریخ میں بدر کی لڑائی وہ پہلا آزمائشی موقع ہے جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ اسلامی جماعت کے اندر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے اندر کچھ جراثیم نفاق کے چھپائے

ہوئے ہیں۔ جنگ کے حالات گزرنے کے بعد قرآن نے ان لوگوں کے طرزِ عمل پر نہایت سختی سے تنقید کی جس کی شہادت سورہ انفال سے مل رہی ہے۔ لیکن اس وقت نہ تو تعین کے ساتھ ان کو مخاطب کر کے انہیں رسوا کیا گیا اور نہ ان کو جماعت ہی سے الگ کیا گیا۔ اس کے بعد ہر آزمائش کے موقعہ پر یہ گروہ اپنی کمزوریاں ظاہر کرتا رہا، لیکن عام تنقید و نصیحت کے سوا قرآن نے ان پر براہ راست کوئی ضرب نہیں لگائی۔ تقریباً معرکہ تبوک تک یہی صورتِ حال قائم رہی۔ لیکن جب ان لوگوں پر اچھی طرح حجت تمام ہوگئی اور یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ ان لوگوں کی شرارتیں کسی بے علمی یا اتفاقی مغلوب الحالی کا نتیجہ نہیں ہیں، بلکہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں سوچ سمجھ کر ٹھنڈے دل سے کر رہے ہیں تو پھر یہ لوگ جماعت کے اندر سے کاٹ کر علیحدہ کر دیے گئے۔

باب ۱۱

داعی حق کی ذمہ داری

داعی حق ہو یا داعی ضلالت، دونوں میں سے کسی کو بھی اللہ تعالیٰ نے دعوت اور ترغیب سے زیادہ کسی چیز کا اختیار نہیں بخشا ہے نہ پیغمبروں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی شخص کے دل میں ہدایت ڈال دیں اور نہ شیطان ہی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی شخص کو گمراہی کی راہ پر لگا دے۔ ان میں سے ہر ایک کو بس یہ اختیار حاصل ہے کہ یہ اپنی اپنی راہ کی طرف خلق خدا کو بلا سکتے ہیں۔ ہدایت یا ضلالت کو اختیار کرنا، اختیار کرنے والے کی اپنی پسند اور اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق تیسیر پر منحصر ہے۔ اس توفیق اور تیسیر کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ضابطہ بنا دیا ہے جس کے مطابق وہ اپنے سلیم الفطرت اور ہدایت پسند بندوں کو نبیوں کے رستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرماتا ہے اور کجروی اور گمراہی کو پسند کرنے والوں کے لیے شیطان کے راستوں پر چلنا آسان کر دیتا ہے۔ یہی حقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ان آیات میں واضح کی گئی ہے:

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ

(القصص ۲۸:۵۶)

''تم جن کو چاہو، ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔''

وَ مَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَ لَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ (یوسف ۱۲:۱۰۳)

''اور ان لوگوں میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں خواہ تم ان کے ایمان کی کتنی ہی حرص کرو۔''

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰی هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ یُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ (النحل ۱۶:۳۷)

''اگر تم ان کی ہدایت کے حریص ہو تو اللہ ایسوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا جن کو گمراہ کر دیتا ہے اور ان کا کوئی مددگار نہیں بنتا۔''

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ (ابراہیم ۱۴:۱)

''یہ کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اس لیے اتاری ہے کہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ، ان کے رب کے اذن سے۔''

اسی ابلیس کو خطاب کر کے فرماتا ہے:

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ (الحجر ۱۵:۴۲)

''میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا۔ بجز ان کے جو گمراہوں میں سے تیرے پیرو بن جائیں۔''

خود ابلیس کی زبان سے اس کا یہ اعتراف نقل کیا ہے:

وَمَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ (ابراہیم ۱۴:۲۲)

''اور مجھے تم پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ بس میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے میری بات مان لی تو مجھے ملامت نہ کرنا، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔''

اس امر واقعی کی وجہ سے جہاں تک ایک داعی کا تعلق ہے وہ اس مسئلہ پر بالکل غور نہیں کرتا اور نہ اسے غور کرنا چاہیے کہ لوگ اس کی دعوت پر کان دھریں گے یا نہیں اور نہ اس فکر میں وہ سر کھپاتا اور نہ اس کو سر کھپانا چاہیے کہ زمانہ اس کی دعوت کے لیے سازگار ہے یا

ناسازگار۔ وہ لوگوں کے رد وقبول، اپنی کوششوں کی کامیابی اور ناکامی اور دعوت حق کے انجام کے متعلق ایک بار یہ فیصلہ کر کے اس امر کا تعلق اس کی ذات سے نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے، بالکل مطمئن ہو جاتا ہے۔ وہ صرف اس بات پر غور کرتا ہے کہ خود اس کا اپنا فرض کیا ہے اور جب یہ طے کر لیتا ہے ہے کہ وہ اس مقصد کی دعوت دے جس کو وہ حق یقین کر رہا ہے اور جو اس کے خیال میں تمام دنیا کے لیے یکساں مفید ہے، تو یہ طے کر چکنے کے بعد وہ اس تردد میں نہیں پڑتا کہ لوگ اس کی دعوت کو قبول کرنے کے بارہ میں اپنا فرض پورا کریں گے یا نہیں اور اللہ تعالیٰ اس دعوت کو دنیا میں برپا کرنے گا یا نہیں۔

جہاں تک لوگوں کے رد وقبول کا تعلق ہے وہ اس کی دعوت کو قبول کریں یا نہ کریں، دونوں صورتوں میں اس کی اپنی ذمہ داری بدستور قائم رہتی ہے۔ اگر وہ قبول کریں گے تو ان کے لیے دنیا اور آخرت میں کامیابی اور فلاح کی راہیں کھلیں گی اور یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ادائے فرض و دعوت کا اجر وثواب حاصل کرے گا۔ اور اگر نہ قبول کریں گے تو اس کے ذریعہ سے لوگوں پر خدا کی حجت پوری ہوگی اور داعی اللہ کے ہاں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش قرار دیا جائے گا کہ اس کا جو فرض تھا اس نے پورا کر دیا۔ قرآن میں داعیان حق کی ایک جماعت کا جواب نقل ہوا ہے جن کو ان لوگوں کے سامنے بے فائدہ اپنی دعوت پیش کرنے سے روکا گیا تھا جو دعوت کو قبول کرنے والے نہیں تھے۔ اس جواب میں داعی حق کے فرض کی نوعیت واضح ہوتی ہے کہ لوگ اس کی دعوت کو قبول کریں یا نہ کریں، دونوں صورتوں میں اس کا فرض صرف حق کی دعوت دیتے رہنا ہے۔ اگر لوگ قبول کریں گے تو ہدایت پائیں گے اور اگر نہ قبول کریں گے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں بری الذمہ قرار پائے گا:

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ (الاعراف ۷: ۱۶۴)

"اور یاد کرو جب کہ ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کیے جا

رہے ہو، جنھیں یا تو اللہ ہلاک کرنے والا ہے، یا انہیں ایک سخت عذاب دینے والا ہے۔ وہ بولے کہ یہ اس لیے کہ یہ تمہارے رب کے سامنے ہماری طرف سے عذر بن سکے اور تا کہ یہ خدا کے غضب سے بچیں۔"

باقی رہا اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کا معاملہ تو مجرد یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اس حق کو واضح کیا ہے، اس کے دل کے اندر یہ اطمینان پیدا کرتی ہے کہ اس حق کی دعوت دینا، لوگوں کے لیے اس کا قبول کرنا اور دنیا میں اس کا فروغ پانا ممکن ہے اور اگر وہ اس کی طرف لوگوں کو بلانے اور دنیا میں اس کا برپا کرنے کا عزم لے کر اٹھے گا تو اللہ ضرور اس کام میں اس کی امداد فرمائے گا۔ ایک رحیم و کریم خدا کے متعلق وہ یہ بدگمانی نہیں کر سکتا کہ جس راستہ کی طرف وہ رہبری کرے کہ یہ صراطِ مستقیم ہے اس راستہ پر چلنا ناممکن ہو اور جس نظامِ زندگی کی بابت وہ فرمائے کہ یہ فطری نظامِ زندگی ہے وہ اتنا پیچیدہ اور ناممکن العمل ہو کہ لوگ اس کو اختیار ہی نہ کر سکیں۔ نیز ایک عادل اور مہربان پروردگار کے متعلق وہ یہ بدگمانی بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اس پر ایک فرض عائد کر کے یہ حکم دے کہ تیرے کرنے کا کام یہ ہے اور اسی کے کرنے میں تیری نجات اور میری خوشنودی ہے، لیکن جب وہ اس کو کرنا شروع کرے اور اس کے سامنے مشکلیں آئیں تو وہ اس کو تنہا بے یار و مددگار چھوڑ دے اور اس کی کوئی مدد نہ فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ حسنِ ظن اور یہ اعتماد ہر داعی حق کے اندر موجود ہوتا ہے اور مخالفین جب اس کی راہ میں روڑے اٹکانے شروع کرتے ہیں اور بظاہر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ کام اب آگے نہیں بڑھنے کا ہے تو یہی اعتماد اس کی ڈھارس بندھاتا ہے کہ جس راستہ کی طرف خود خدا نے انگلی اٹھا کر اشارہ فرمایا ہے کہ راہ حق یہ ہے تو اس پر چلنے والا منزل مقصود تک ضرور پہنچ کر رہے گا اور اس راہ میں خواہ کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ پیش آئیں، لیکن بالآخر اللہ کی مدد ضرور آ کے رہے گی۔ داعیان حق کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہی تعلق اور اعتماد ہے جو سورۂ ابراہیم کی اس آیت سے ظاہر ہو رہا ہے:

وَ مَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَکَّلَ عَلَی اللّٰهِ وَ قَدۡ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَ لَنَصۡبِرَنَّ عَلٰی مَاۤ اٰذَیۡتُمُوۡنَا ؕ وَ عَلَی اللّٰهِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُتَوَکِّلُوۡنَ ﴿۱۲﴾ (ابراہیم ۱۴:۱۲)

''اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ رکھیں جب کہ اس نے ہمیں ہمارے راستوں کی ہدایت بخشی اور تم ہمیں جو ایذا بھی پہنچاؤ گے ہم اس پر صبر کریں گے اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔''

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ داعی اپنی ذمہ داری کے حدود معین کرنے میں غلطی کر جاتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ اس پر صرف اسی حد تک ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ حق کو لوگوں تک ٹھیک ٹھیک پہنچا دے، بلکہ وہ اس بات کا بھی ذمہ داری ہے کہ لوگ اس حق کو قبول بھی کر لیں۔ اس غلطی کا لازمی نتیجہ ایک تو یہ ہوتا ہے کہ داعی کے اندر حق خالص کو پیش کرنے کی بجائے مخالفین کے باطل عقائد و افکار کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے، اور دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بالکل غلط ذمہ داری اپنے سر اٹھا لینے کی وجہ سے اپنی زندگی سخت افکار اور الجھنوں میں ڈال دیتا ہے۔ اس طرح کی غلطیوں سے بچانے کے لیے قرآن مجید نے مفصل ہدایات دی ہیں، مثلاً:

وَ مَا عَلَی الَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ وَّ لٰکِنۡ ذِکۡرٰی لَعَلَّهُمۡ یَتَّقُوۡنَ ﴿۶۹﴾ (الانعام ۶:۶۹)

''جو اللہ سے ڈرتے ہیں ان پر ان لوگوں کے حساب کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ بس یاد دہانی کر دینا ہے تا کہ وہ بھی ڈریں۔''

اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشۡرَکُوۡا ؕ وَ مَا جَعَلۡنٰکَ عَلَیۡهِمۡ حَفِیۡظًا ۚ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِوَکِیۡلٍ ﴿۱۰۷﴾ (الانعام ۶:۱۰۶-۱۰۷)

''تم بس اس چیز کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر وحی کی جا رہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور مشرکوں سے اعراض کرو۔ اور اگر اللہ چاہتا تو یہ شرک نہ کر پاتے

(لیکن اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملے میں زبردستی نہیں کی ہے) اور ہم نے تم کو ان پر نگران نہیں مقرر کیا ہے (کہ یہ کوئی غلطی نہ کرنے پائیں) اور نہ تم ان کے ضامن ہو (کہ ان کے ایمان کے معاملہ کی ذمہ داری تم پر ہو۔)"

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ (الرعد ۱۳: ۴۰)

"پس تمہارے اوپر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ حساب کی ذمہ داری ہم پر ہے۔"

طٰهٰ ۝ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝ (طٰہٰ ۲۰: ۱-۳)

"یہ سورۂ طٰہٰ ہے۔ ہم نے تم پر قرآن اس لیے نہیں اتارا ہے کہ تم مصیبت میں پھنس جاؤ۔ یہ تو بس ان لوگوں کے لیے یاددہانی ہے جو خدا سے ڈریں۔"

اس زمانہ میں جو لوگ طاغوت کے عالمگیر تسلط کی وجہ سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور دعوت حق کا کوئی امکان نہیں پا رہے ہیں یا دعوت حق کے پھیلنے کا امکان نہ پا کر دعوت باطل ہی میں لگ گئے ہیں، یہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ ان لوگوں کے سامنے اگر یہ حقیقت واضح ہوتی کہ ان کی ذمہ داری صرف ابلاغ ہے۔ لوگوں کا ان کا پیش کی ہوئی دعوت کو قبول کرنا یا نہ کرنا اور اس دعوت کا فروغ پانا یا نہ پانا ان سے متعلق نہیں ہے، بلکہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ سے متعلق ہے تو نہ وہ امکان اور عدم امکان کی الجھنوں میں پڑتے اور نہ وہ ایک باطل کو برپا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لیتے، بلکہ اپنے بس بھر حق کی دعوت دیتے اور اللہ تعالیٰ سے امید رکھتے کہ جب وہ خود حق ہے اور حق کو دوست رکھتا ہے تو اس حق کو ضرور برپا کرے گا جس کی وہ دعوت دے رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے بوجھ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری بھی اپنے کاندھوں پر اٹھا لینی چاہی اور جب انہیں اندازہ ہوا کہ یہ بوجھ بھاری ہے، ان سے نہیں اٹھ سکے گا تو مجبوراً ان کو یہ اعلان بھی کرنا پڑا کہ ہر چند خیر و برکت والا نظام تو وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے، لیکن اس زمانے میں اس کا وسیع پیمانہ پر قیام چونکہ ناممکن ہے، اس وجہ سے اس کے سوا چارہ نہیں

کہ ایک غیر اسلامی نظام ہی کی دعوت دی جائے اور اسی کو قبول کرلیا جائے۔

اس خیال کے اندر جو گمراہیاں چھپی ہوئی ہیں، ان سب کو نہ ظاہر کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ان کے ظاہر کرنے کی یہاں گنجائش ہے۔ البتہ ایک بات کی طرف ہم اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ ان حضرات نے دیدہ و دانستہ حق کی راہ چھوڑ کر باطل کی راہ محض اس خیال سے اختیار کی کہ اس راہ پر چل کر وہ بزعم خود آسانی سے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں، حالانکہ اس راہ میں بھی کامیابی ـــــــ جس کو وہ کامیابی سمجھتے ہیں ـــــــ اگر حاصل ہوگی تو اللہ کے حکم ہی سے حاصل ہوگی، نہ کہ خود ان کی سعی و تدبیر سے۔ تو بجائے اس کے وہ ایک باطل راہ پر چل کر اس بات کا انتظار کرتے کہ اللہ تعالیٰ اس راہ میں ان کی رسی دراز کرے، کیا یہ بہتر نہ تھا کہ وہ خود بھی راہ حق پر چلتے، اور اسی پر چلنے کی دوسروں کو بھی دعوت دیتے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق اور کامیابی کے منتظر رہتے۔

یہ خطرناک غلطی جس نے ان کی ساری جدوجہد کو ایک بالکل غلط راہ پر لگا دیا، صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ بحیثیت داعی انہوں نے اپنی ذمہ داری کے حدود کو ٹھیک ٹھیک معین نہیں کیا۔ انہوں نے اپنا فرض صرف اسی قدر نہیں سمجھا کہ جس حق کی طرف اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت کی ہے اس حق کو بلاکم و کاست لوگوں تک پہنچا دیں، بلکہ اپنا فرض یہ بھی سمجھا کہ لوگوں کو اس کا معتقد بھی بنا دیں اور جب یہ کام انہیں بہت مشکل نظر آیا تو انہوں نے حق کو چھوڑ کر باطل ہی کو اختیار کرلیا کہ لوگ آسانی سے اس کے معتقد بن سکیں گے۔ یہ غلطی لازمی طور پر ایک داعی کو رحمان کے راستہ سے ہٹا کر شیطان کے راستہ پر ڈال دیتی ہے اور وہ صرف داعی ہی نہیں رہ جاتا، بلکہ مدعی بن کر خدا کے حقوق میں دراندازی کرنے والا اور ایک نیا دین پیش کرنے والا بن جاتا ہے۔

ایک داعی اگر اپنی حیثیت کو اچھی طرح پہچانتا ہے تو اس سے اس بات کا اندیشہ تو نہیں ہوسکتا کہ وہ مایوس اور بددل ہو کر بیٹھ رہے یا حق کی جگہ باطل ہی کی دعوت شروع کردے، البتہ اس کو اس پہلو سے اپنی نگرانی کرنی پڑتی ہے کہ کہیں اس خیال کی وجہ سے کہ اس کے

اوپر صرف بلاغ ہی کی ذمہ داری ہے، اس کے اندر بے پروائی اور سہل انگاری نہ پیدا ہو جائے۔ اپنے آپ کو اس چیز سے بچانے کے لیے اس کو ہمیشہ ان ذمہ داریوں کو سامنے رکھنا پڑتا ہے جو داعی پر بحیثیت داعی عائد ہوتی ہیں اور جن کا لحاظ نہ رکھنے کی صورت میں ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس سے مواخذہ ہو جاوے کہ اس نے تبلیغ یا ادائے شہادت کا فرض اس طرح ادا نہیں کیا جس طرح اس کو ادا کرنے کا حق تھا۔ حضرت انبیاء علیہم السلام کا جہاں تک تعلق ہے ان کو فرضِ رسالت کی ذمہ داریوں کا اس درجہ شدید احساس ہوتا تھا کہ بسا اوقات نہ اپنے ضروری آرام کا خیال کرتے نہ اپنی اور اپنی دعوت کی عزت وشان کا۔ بلکہ ان کے غیر معمولی انہماک سے ایسا ظاہر ہوتا کہ گویا وہ اپنے آپ کو لوگوں کے کفر و ایمان کا ذمہ دار سمجھ رہے ہیں۔ اس انہماک پر اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو محبت آمیز انداز میں ٹوکا ہے جس کی بعض مثالیں ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔ یہی انہماک، افراط و تفریط سے بچ کر، ہر داعی حق کی خصوصیت ہونا چاہیے۔

باب ۱۲

دعوتِ حق کے مخالفین

ہر دعوت حق کو عموماً تین طرح کے مخالفین سے سابقہ پڑتا ہے:

۱۔ معاندین۔

۲۔ متربصین۔

۳۔ مغفلین۔

ان میں سے ہر گروہ کی خصوصیات و صفات اور ان کی نفسیات الگ الگ ہیں، اس وجہ سے ایک حکیم داعی کو ان سے ہر ایک کے ساتھ بالکل علیحدہ علیحدہ معاملہ کرنا پڑتا ہے۔ اور بہت بڑی حد تک دعوت کی کامیابی کا انحصار اسی فرقِ معاملہ پر ہے۔ اگر ایک داعی ان مختلف جماعتوں کو امتیاز کرنے اور ان کے مخصوص محرکات و میلانات کے پہچاننے سے قاصر رہ جائے تو اس کی دعوت کا کامیابی سے ہمکنار ہونا مشکل ہے۔ مسئلہ کی اس اہمیت کی وجہ سے ہم چاہتے ہیں کہ ان تمام جماعتوں کی امتیازی خصوصیات اور ان کے ذہنی میلانات کی تشریح کریں۔

معاندین

معاندین سے مراد وہ گروہ ہے جو دعوت کے اثر کا اندازہ کرتے ہی اس کی مخالفت کے لیے خم ٹھونک کر، میدان میں اتر آتا ہے۔ ان کی مخالفت کی تہ میں یوں تو مختلف قسم کے محرکات کام کرتے ہیں، لیکن تین محرک اصلی اور بنیادی ہیں۔ ایک حمیت جاہلیت۔ دوسرا

استکبار اور حسد۔ اور تیسرا مفاد پرستی۔ یہ تینوں محرکات حق کی مخالفت میں پیش قدمی کے اعتبار سے تو بالکل یکساں نوعیت کے ہیں، لیکن اپنی روح کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں۔

حمیت جاہلیت کی بیماری درحقیقت نظامِ جاہلی کے ساتھ اخلاص و وفاداری کا نتیجہ ہے۔ اس بیماری میں بالعموم وہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں جو اپنے عہد کے نظامِ جاہلی کے مخلص اور وفادار خادم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جب دیکھتے ہیں کہ کوئی دعوت ایسی اٹھ رہی ہے جو اس نظام کو جس کے وہ علمبردار ہیں، توڑ پھوڑ کر اس کی جگہ کوئی نیا نظام برپا کرنا چاہتی ہے تو ان کے اندر ایک ہیجان برپا ہو جاتا ہے۔ ان کو اس میں اپنی قوم کی سیاسی و معاشی تباہی نظر آتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اس سے ان کے قبیلہ میں پھوٹ پڑ رہی ہے اور ان کی بنی ہوئی جمعیت منتشر ہوئی جا رہی ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ یہ دعوت باپ دادا کے معروف طریقہ اور پرانی روایات کے بالکل خلاف ہے۔ اس وجہ سے ان کا دل اس سے کڑھتا ہے۔ یہ ساری باتیں ملا کر ان کے اندر داعی اور دعوت کے خلاف ایک سخت قسم کا غم و غصہ پیدا کر دیتی ہیں اور وہ پورے جوش کے ساتھ اس مخالفت میں لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی یہ مخالفت بیشتر قومی اخلاص پر مبنی ہوتی ہے اس وجہ سے اس میں کمینہ پن اور رذالت کا شائبہ کم ہوتا ہے۔ یہ ایک مردانہ مخالفت ہوتی ہے جس میں جوش تو ہوتا ہے، لیکن یہ جوش شرافت سے عاری نہیں ہوتا۔ اس طرح کی مخالفت میں اس کا امکان موجود رہتا ہے کہ غلط فہمیاں رفع ہونے کے بعد یہ عداوت محبت میں بدل جائے اور اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ محبت بھی ویسی ہی پرجوش اور طاقت ور ہوتی ہے جیسی پرجوش اور طاقتور عداوت ہوتی ہے۔ اسلامی دعوت کی تاریخ اس کی بہترین مثال ابوجہل اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مخالفت ہے۔ ابوجہل دعوت اسلام کی مخالفت میں آخر دم تک جس درجہ سرگرم رہا ہر شخص کو معلوم ہے، لیکن اس شدید عناد کے باوجود اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی رکیک الزام لگانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ جب آپ دعوت کے لیے نکلتے تو جوش مخالفت میں سایہ کی طرح آپ کے ساتھ ساتھ ہوتا تا کہ کوئی آپ کی بات سننے نہ پائے۔ لیکن جب مخالفت

کرتا تو اس کا یہ انداز ہوتا کہ ''اے محمد! میں یہ تو نہیں کہتا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو لیکن تمہاری دعوت باپ دادا کے طریقہ کے خلاف ہے''۔ اس کو سب سے زیادہ غصہ اس بات پر تھا کہ اسلامی دعوت قریش کی جمعیت کو پارہ پارہ کر رہی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے بڑا الزام جو وہ لگاتا تھا وہ یہ تھا کہ آپ نے بیٹے کو باپ سے اور بھائی کو بھائی سے جدا کر کے ان کو ایک دوسرے کا حریف بنا دیا۔ چنانچہ بدر کے معرکے کے موقع پر جب اس نے دیکھا کہ اسلامی دعوت نے قریش کو قریش ہی کے خلاف صف آرا کر دیا ہے، تو اس نے پورے جوش کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی: ''اَللّٰهُمَّ اقطَعُنا للرَّحم، وآتانا بما لا يُعرف، فاحنه العذاة،[1] (اے خدا! ہم میں جو سب سے زیادہ رشتہ رحم کا توڑنے والا اور اس بدعت کا باعث ہوا ہو اس کو کل شکست دیجیو!) یہ دعا اگرچہ حمیت جاہلیت کے زہر میں بجھی ہوئی ہے، لیکن اس میں ابوجہل کی شرافت نفس اور قوم پرستی کا جو پہلو نمایاں ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح کے مخالفین اگرچہ دعوت کی مخالفت میں کتنے ہی سرگرم ہوں، اپنے اندر ایک جوہر قوم پرستی کا رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ایک داعی حق کی نظروں میں ان کی ایک خاص وقعت ہوتی ہے اور وہ اس بات کا دل سے آرزومند ہوتا ہے کہ ان کا یہ جوہر باطل کی جگہ حق کی خدمت میں استعمال ہو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلامی کے تمام مخالفین میں سے خصوصیت کے ساتھ ابوجہل اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کے لیے دعا کی تاکہ ان کے قبولِ اسلام سے اسلام کی دعوت کو قوت و عزت حاصل ہو۔ آپ کی یہ دعا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارہ میں قبول ہوئی اور اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ان کے اسلام لاتے ہی دفعتہً حالات کچھ سے کچھ ہو گئے۔ قبولِ اسلام سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جس جوش، جس سرگرمی اور جس ہمت و حمیت کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کر رہے تھے، اسلام لانے کے بعد اس سے کہیں زیادہ اولوالعزمی اور مردانگی کے ساتھ سلام کے لیے جاں نثاریاں کرنے لگے۔ ان کی

---

[1] السيرة النبوية الا بن هشام۔ القسم الا ول، ص ٦٢٨

جاہلی حمیت کے اسلامی رنگ اختیار کرتے ہی دوست دشمن ہر شخص کو محسوس ہونے لگا کہ اب اسلام کی صف میں ایک شیر دل مردِ حق آ گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیرت کے اندر وہ جوہر موجود تھا جو انسان کی تمام اعلیٰ صفات کے لیے خمیر کا کام دے سکتا ہے، لیکن یہ جوہر بہت سے جاہلی تصورات کے نیچے دبا ہوا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق کی رگڑ سے جب ان باطل تصورات کا میل اڑ گیا تو نیچے سے وہ کھرا سونا صاف نکل آیا جس کی چمک نے بالآخر دنیا کی نگاہیں خیرہ کر دیں، اپنے عہد کے نظامِ جاہلی کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وابستگی خودغرضی اور مفاد پرستانہ نہیں تھی، بلکہ اسلام لانے سے پہلے سے اسی نظامِ جاہلی کو وہ حق سمجھتے تھے، اسی کو اپنے مقدس باپ دادا کا ورثہ خیال کرتے تھے، اسی کے اندر اپنی قومی عزت کا بقا سمجھتے تھے اور ان تمام وجوہ سے وہ اپنا یہ دینی اور قومی فرض سمجھتے تھے کہ اس کے بہی خواہوں کے بہی خواہ اور اس کے مخالفوں کے دشمن ہوں۔ لیکن جب ان پر یہ بات واضح ہو گئی کہ حقیقت وہ نہیں ہے جو وہ سمجھ رہے ہیں، بلکہ اس کے بالکل برعکس ہے تو اسی جذبہ نے، جو ان کو نظامِ جاہلی کا پر جوش خادم بنائے ہوئے تھا، ان کو اسلام کی خدمت و اعانت کے لیے سربکف کر دیا۔ اس طرح کی سیرت رکھنے والے اشخاص ادنیٰ درجہ کی خودغرضیوں سے بالاتر ہونے کی وجہ سے نہ تو کسی حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اس کے انکار پر اڑتے ہیں اور نہ کسی چیز کو اختیار کر لینے کے بعد اس کے واجبی حقوق اور مطالبات ادا کرنے سے جی چراتے، بلکہ ایک امر کے حق ثابت ہو جانے کے بعد اس کو قبول کرنے کی جرأت بھی رکھتے ہیں اور اس کے لیے اپنے ہر طرح کے ذاتی مفاد قربان بھی کر سکتے ہیں۔ ان کے کردار کا یہی پہلو ہے جس کی وجہ سے وہ جہاں کہیں بھی ہوتے ہیں اپنا ایک خاص درجہ اور مقام رکھتے ہیں۔ اس گروہ میں مختلف ٹائپ کے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض کی حمیت اپنے حدود سے گزر کر انانیت اور خود پرستی کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور ان کو آخر دم تک جاہلیت کے پھندے سے نکلنا نصیب ہی نہیں ہوتا، جیسے ابوجہل۔ بعض تھوڑی سی کشمکش کے بعد کسی معمولی سی تنبیہ سے متنبہ ہو کر راہ حق پا لیتے ہیں، جیسے حضرت عمر اور

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما بعض جاہلیت کے غلاف سے نکلنے میں بڑی دیر لگاتے ہیں، جیسے ابوسفیانؓ، لیکن ایک وصف ان سب میں مشترک ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جب یہ جاہلیت کو چھوڑ کر اسلام اختیار کرتے ہیں تو آتے ہی اسلام کی صفِ اوّل میں اپنی جگہ اسی طرح بنا لیتے ہیں جس طرح کل تک وہ جاہلیت کی صفِ اوّل میں تھے: "خیارھم فی الجاھلیة خیارھم فی الاسلام"[1] (ان میں سے جو دورِ جاہلیت میں بہترین تھے وہ اسلام کے زمانہ میں بھی بہترین ہیں)۔

استکبار اور حسد کی وجہ سے دعوت حق کی مخالفت بالعموم وہ لوگ کرتے ہیں جو روایتی دینداری یا موروثی مالداری کی وجہ سے نظامِ جاہلی کے اندر پیشوائی اور سرداری کے مقام پر متمکن ہوتے ہیں۔ یہ لوگ آگے چلتے رہنے کی وجہ سے آگے چلنے کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ حق کے پیچھے چلنے میں بھی انہیں عار محسوس ہوتا ہے اور وہ بجائے اس کے کہ حق کے پیچھے چلیں، کوشش اس بات کی کرتے ہیں کہ حق کو اپنے پیچھے چلائیں۔ موروثی دینداروں کی ذہنیت بالعموم یہ ہوتی ہے کہ وہ حق کو اپنے باپ دادا کی میراث اور اپنی ذاتی جائیداد خیال کرنے لگ جاتے ہیں اور عقیدت واحترام کے ماحول میں پلنے بڑھنے کی وجہ سے وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ حق ان کی ذات اور ان کے حلقہ سے باہر بھی پایا جا سکتا ہے۔ موروثی مالداروں کا حال یہ ہے کہ وہ دنیوی شان وعظمت کو اپنے برحق ہونے کی دلیل ٹھہرا لیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ جب انہیں عزت وعظمت حاصل ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ انہی کا فکر اور انہی کا عمل حق بھی ہے۔ اس طرح کی ذہنیت کے لوگوں کو جب کوئی ایسی دعوت چیلنج کرتی ہے جو ان کی روایتی دینداری کے خلاف ہوتی ہے یا جس کی زد ان کی خواہشوں پر پڑتی ہے تو یہ تلملا کے اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بالخصوص اس صورت میں ان کی مخالفت بہت ہی سخت وشدید ہو جاتی ہے جب یہ دعوت ان کے حلقہ کے سوا کسی اور حلقہ سے بلند ہوتی ہو۔ یہ لوگ اس غرور میں مبتلا ہوتے ہیں کہ حق ہمارے

---

[1] صحیح البخاری: کتاب الانبیاء، باب ۵۴

ساتھ ہے اور ہمیشہ ہمارے ہی ساتھ رہے گا۔ اور اگر بالفرض ہمارے اندر سے غائب بھی ہو جائے تو جب کبھی بھی اس کو دنیا پر ظاہر ہونا ہے ہمارے ہی واسطہ سے ظاہر ہونا ہوگا۔ اس غرور کے ساتھ ظاہر ہے کہ کسی ایسے حق کو قبول کرنا ان لوگوں کے لیے تقریباً ناممکن ہے جس کے داعی وہ خود نہ ہوں۔ چنانچہ دعوت حق کی پوری تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ جو لوگ اس مرض میں مبتلا رہتے ہیں ان کو حق پر ایمان لانے کی بہت کم ہی توفیق نصیب ہوئی ہے۔ مکہ اور طائف کے وہ سردار جو کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو اگر کوئی نبی بھیجنا ہی ہوتا تو وہ ہمارے اندر سے کسی کو بھیجتا، اسی بیماری میں مبتلا تھے۔ یہی لوگ تھے جو اسلام کے حق اور اس کے ایک نعمت الٰہی ہونے کے اس بنا پر منکر تھے کہ اگر یہ حق اور اللہ کا اتارا ہوا دین ہوتا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ہم سے پہلے یہ رذیل اور فاقہ مست لوگ اس کو پاتے! انہی لوگوں کے ساتھ یہود بھی شریک تھے جن کی اسلام کے ساتھ ساری عداوت ومخالفت کی تہ میں صرف یہ جذبہ کام کر رہا تھا کہ اگر وہ اس حق کو مانے لیتے ہیں تو ان کی دینی پیشوائی کی ساری عزت و فضیلت خاک میں مل جاتی ہے۔ اس طرح کے لوگ اگرچہ بعض اعتراضات وشبہات بھی دعوت حق کے خلاف پیش کرتے ہیں تاکہ اپنی مخالفت کو جائز اور معقول ثابت کر سکیں، لیکن حقیقت میں یہ سارے اعتراضات وشبہات محض اصل محرک مخالفت، استکبار وحسد پر پردہ ڈالنے کے لیے گھڑے جاتے ہیں۔ اس طرح کے مخالفین ایک داعی حق کے لیے اپنے اندر امید سے زیادہ مایوسی کا پہلو رکھتے ہیں۔ ان میں بہت تھوڑے نکلتے ہیں جن کو قبول حق کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ یہ اپنے استکبار کی وجہ سے اپنے آپ کو الوہیت کے منصب پر سرفراز کر لیتے ہیں اور اس منصب کو چھوڑنا اس وقت تک گوارا نہیں کرتے جب تک اس کو چھوڑنے پر مجبور نہ کر دیئے جائیں۔ قرآن مجید میں استکبار کو قبول حق کے سب سے بڑے موانع میں سے شمار کیا گیا ہے اسی وجہ سے جگہ جگہ قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کے پیچھے زیادہ وقت ضائع کرنے سے روکا گیا ہے جو دنیوی مال ومتاع کی فراوانی یا مذہبی ودنیوی ریاست کی وجہ سے اپنے غرور میں سرمست ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے

اپنے وقت کے فقیہوں اور فریسیوں کے غرور ہی کی بنا پر فرمایا تھا کہ ''مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں کیونکہ آسمان کی بادشاہی ان کی ہے۔''[1] نیز فرمایا تھا کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو۔''[2] بعد کے واقعات نے اس پیشین گوئی کی پوری پوری تصدیق کر دی۔ انجیل اور قرآن مجید، دونوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت پر یروشلم کے علماء اور فقہاء میں سے ایک شخص بھی ایمان نہیں لایا۔ یہاں تک کہ ان سے مایوس ہو کر حضرت کو دریا کے کنارے کے ماہی گیروں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنی پڑی۔ اور انہی کے اندر سے اللہ کے کچھ بندے ان کو ایسے ملے جنہوں نے دعوت حق کے اس کام کو سنبھالا۔ کم و بیش یہی صورت حال اس وقت پیش آئی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بلند ہوئی۔ اہل کتاب کے پیشوایانِ دینی میں سے صرف گنتی کے چند نفوس اسلام لائے، بقیہ سارے کے سارے اپنی پیشوائی اور مشیخت کے غرور میں حق کی مخالفت پر اڑے رہے۔ جو لوگ ایمان لائے ان کی صفات جہاں قرآن مجید نے گنائی ہیں۔ وہاں ان کی سب سے نمایاں صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ ''وَّاَنَّهُمۡ لَا يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ﴿۸۲﴾'' (المائدۃ ۵:۸۲) (اور یہ تکبر نہیں کرتے)۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جن کے دلوں کو مذہبی اور دنیوی ریاست کا کوئی روگ نہیں لگا تھا اور وہ اپنے آپ کو حق سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے۔ اس گروہ کی ایک خاص خصوصیت یہ تھی ہے کہ شروع شروع میں یہ اپنے استکبار کی وجہ سے دعوت کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کی طرف کچھ توجہ نہیں کرتا، لیکن جب دعوت بڑھنے اور پھیلنے لگتی ہے اور ان کو اپنے پاؤں کے نیچے کی زمین کھسکتی نظر آتی ہے تو ان پر حسد کا سخت دورہ پڑتا ہے۔ اس وقت وہ داعی اور دعوت کی مخالفت میں وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جو ایک مبتلائے حسد گروہ کر سکتا ہے۔

---

[1] انجیل متّی۔ باب۵:۳

[2] انجیل متّی۔ باب۱۹:۲۴

مفاد پرستی کی وجہ سے دعوت کی مخالفت وہ لوگ کرتے ہیں جن کا اخلاقی تصور حُبِّ ذات سے آگے نہیں بڑھتا۔ ان کا سارا اخلاقی و اجتماعی فلسفہ اپنی ذات سے شروع ہوتا ہے اور پھر برابر اسی محور پر گھومتا رہتا ہے۔ یہ محض انسان کی اس فطری مجبوری کی وجہ سے کہ وہ ایک اجتماعی وجود ہے، جو تنہا زندگی بسر نہیں کرسکتا، کسی اجتماعی نظام کے اندر شامل تو ہوتے ہیں، لیکن اس کے اندر ہر قدم پر صرف استحقاق تلاش کرتے ہیں، کسی جگہ بھی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ان کے نزدیک حق اور باطل کا معیار ان کی اپنی ذات ہے۔ جس چیز سے ان کی ذات کا بھلا ہو وہ حق ہے اور جس چیز سے ان کے کسی ذاتی مفاد کو ٹھیس لگ رہی ہو وہ باطل ہے۔ جن لوگوں کا اخلاقی اور اجتماعی تصور اتنا پست ہو وہ لازماً ہر اس دعوت کی مخالفت کرتے ہیں جس سے ان کی مفاد پرستی کا یہ گھنونا پن دوسروں کے یا خود ان کے سامنے واضح ہو رہا ہو۔ اس طرح کے لوگ ان تمام جوہری صفات سے بالکل عاری ہوتے ہیں جن سے ایک اعلیٰ سیرت کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس وجہ سے کسی نظامِ حق کے لیے ان کا وجود فطری طور پر ویسا ہی نکما ہے جس طرح ایک عنین کا وجود ایک عورت کے لیے۔ یہ اپنی طبعی پست اخلاقی اور دنایت کی وجہ سے کسی فاسد دعوت اور فاسد نظام ہی کی طرف میلان رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ بھی ان کی وابستگی بالکل منافقانہ اور خودغرضانہ ہی ہوتی ہے۔ اس کے لیے اپنے دلی جوش و جذبہ کے ساتھ ایک چوٹ بھی کھانے کے لیے وہ تیار نہیں ہوتے۔ اسلامی دعوت کی تاریخ میں اس کی نہایت حقیقت افروز مثال ابولہب کا وجود ہے۔ جس کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے سارا اختلاف محض اس وجہ سے تھا کہ آپ کی دعوت سے اس کی سیرت کے تمام بدنما پہلو لوگوں کے سامنے آرہے تھے اور اپنی خودغرضی اور زر پرستی سے اس نے جو دولت اکٹھی کر رکھی تھی وہ سب معرض خطر میں تھی۔ یوں تو وہ قریش کے قائم کردہ نظامِ جاہلی میں سب سے اونچے عہدہ پر فائز تھا، لیکن اس نظام کے ساتھ اس کی ساری وابستگی محض اس وجہ سے تھی کہ منصب رفادہ اور خانہ کعبہ کی کلید برداری کی وجہ سے اس کو مالی دستبرد کے بہت سے مواقع حاصل تھے۔ اس سے آگے نہ

تو اس کو اپنی قوم سے کوئی ہمدردی تھی اور نہ اس نظام کے خیر وشر ہی سے کوئی دلچسپی تھی جس کا وہ سب سے بڑا لیڈر تھا۔ اس کا سب سے واضح ثبوت یہ ہے کہ یوں تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی مخالفت میں آگے رہتا اور لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرتا کہ یہ آباء واجداد کے قائم کردہ نظام کو برباد کرنے والی دعوت ہے، لیکن بدر کے موقع پر، جو قریش کے نقطہ نظر سے ایک فیصلہ کن معرکہ تھا اور جس میں ان کے تمام سردار پورے جوش دینی کے ساتھ شریک ہوئے، وراثت ابراہیمی کا یہ سب سے بڑا دعویدار گھر میں بیٹھا رہا اور کرایہ کے ایک آدمی کو اپنی طرف سے میدان میں لڑنے کے لیے بھیج دیا۔ اس طرح کے لوگوں کا ہر دعوت حق کے ساتھ فطری تعلق صرف مخالفت ہی ہو سکتا ہے اور مخالفت ہی کا ہوتا ہے۔ یہ دنایت اور رذالت میں اتنے پختہ اور مشاق ہو جاتے ہیں کہ کوئی ایسی دعوت جو مکارمِ اخلاق کی طرف بلا رہی ہو، جو ہمدردی، مساوات اور اخوت کا مطالبہ کر رہی ہو، جو ایثار، قربانی اور جاں نثاری کے لیے پکار رہی ہو، ان کو اپیل کر ہی نہیں سکتی۔ اس قسم کی دعوت کے لیے ان کے کان بہرے اور ان کے دل مردہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ اس کی طرف اپنے اندر کوئی میلان نہیں پاتے، بلکہ اس سے نفرت اور کراہت محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کی مخالفت بھی، ان کی اخلاقی پستی کی وجہ سے، نہایت رذیل اور کمینہ مخالفت ہوتی ہے۔ یہ اعلانیہ اور اصولی مخالفت کے بجائے بالعموم چغلی اور بدگوئی پر اتر آتے ہیں اور ہمز ولمز کے ذریعہ سے اپنی لیڈری کا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

متربصین

متربصین سے مراد وہ گروہ ہے جو دعوت حق کا حق ہونا تو کسی حد تک محسوس کر لیتا ہے، لیکن نہ تو اس کے اندر اتنی اخلاقی قوت ہی ہوتی کہ وہ حق کو، مجرد اس بنا پر کہ وہ حق ہے قبول کر کے اس کے لیے سرِ دھڑ کی بازی لگا سکے اور نہ عقلی اعتبار سے یہ لوگ اتنے بلند ہوتے ہیں کہ نظامِ حق کے عملاً برپا ہونے سے پہلے کامیابی کے ان امکانات کا اندازہ کر سکیں جو حق

کے اندر مضمر ہوتے ہیں۔ اس کمزوری کی وجہ سے یہ گروہ بجائے اس کے کہ کسی حق کے حق ہونے کا فیصلہ اپنی عقل سے کرے، اس معاملہ کو مستقبل کے حوالہ کر کے انتظار کرتا ہے کہ اگر مستقبل نے اس کی کامیابی کا فیصلہ کر دیا تو اس کا ساتھ دیں گے ورنہ زندگی جس نہج پر گزر رہی ہے، گزرتی جائے گی۔ یہ لوگ اپنی اخلاقی کمزوری اور عقلی ضعف کی وجہ سے ایک ذہنی کشمکش اور تردد و تذبذب کی حالت میں مبتلا ہوتے ہیں اس وجہ سے دعوت حق کی مخالفت میں یہ بہت سرگرم تو نہیں ہوتے، لیکن وقت کے نظامِ غالب کے اثر سے ساتھ مخالفین دعوت ہی کا دیتے ہیں اور حق و باطل کی کشمکش کے ہر مرحلہ میں زیادہ تر ان کی کوشش اس بات کے لیے ہوتی ہے کہ کوئی صورت سمجھوتے کی پیدا ہو جائے کہ حق و باطل، دونوں ساتھ ساتھ مل کر چل سکیں۔ یہ لوگ ایک بڑی حد تک منکرین حق کے گروہ میں وہی پوزیشن رکھتے ہیں جو موافقین حق کے گروہ میں منافقین کا ہوا کرتا ہے اور اپنی اخلاقی کمزوری کی وجہ سے حق کی بڑی سے بڑی کامیابی کے بعد بھی ان کا تربص اور انتظار ختم نہیں ہوتا۔ ابتدائی دعوت اسلام میں جو لوگ اس طرح کی ذہنی حالت رکھنے والے تھے وہ بدر کے موقع پر یہ کہتے تھے کہ اگر اس معرکہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں کو کامیابی ہوئی تو مان لیں گے کہ انہی کی دعوت، حق ہے اور اس کا ساتھ دیں گے۔ لیکن جب یہ معرکہ سر ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غالب کیا تو انہوں نے اپنے معاملہ کا فیصلہ آئندہ لڑائیوں کے نتائج پر ملتوی کر دیا۔ ان جنگوں کا فیصلہ بھی جب قریش کے خلاف ہی نکلا تو عملاً قریش کی فوجی قوت بالکل ٹوٹ گئی تو یہ اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں یہود کی منظم طاقت سے اسلام کا مقابلہ کیسا رہتا ہے۔ جب یہود کی طاقت بھی درہم برہم ہو گئی تو ان کا انتظار ختم ہو جانا چاہیے تھا، لیکن اس کے بعد بھی ان کی ایک جماعت باقی رہی جو اس تصادم کے نتیجہ کا انتظار کرنے لگی جو رومیوں اور مسلمانوں میں برپا ہونے والا تھا۔ اس طرح یہ لوگ ایک غیر مختتم انتظار میں مبتلا رہے اور اس وقت تک ایمان نہیں لائے جب تک ان کے لیے کفر پر قائم رہنا ناممکن نہیں ہو گیا۔

اس گروہ کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ یہ لوگ حق کو عقل سے پرکھ کر اس پر ایمان لانا نہیں چاہتے، بلکہ اس کے غلبہ کو آنکھوں سے دیکھ کر اس پر ایمان لانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ یہ خواہش بعینہٖ اسی طرح کی خواہش ہے جس کا اظہار ان لوگوں کی طرف سے ہوا جو خدا پر ایمان لانے سے پہلے اس کو دیکھنے کی آرزو رکھتے تھے۔ یہ خواہش ایک طفلانہ خواہش ہے اور خدا اور اس کے رسول نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی ہے، بلکہ صاف صاف یہ فرمایا ہے کہ ایمان صرف وہ معتبر ہے جو عقل سے سمجھ کر لایا جائے، نہ کہ آنکھوں سے دیکھ کر۔ جو شخص ایک حق کو حق اس لیے مانتا ہے کہ اس کے اچھے نتائج و ثمرات اس کے سامنے موجود ہیں یا اس کی مخالفت کے برے نتائج وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے وہ درحقیقت حق پر ایمان نہیں لایا ہے، بلکہ وہ یا تو فوائد کی پوجا کر رہا ہے، یا نقصانات کے ڈر سے سہما ہوا ہے۔ جو انسان ظاہر پرستی کے اس درجہ تک گر جاتا ہے اس میں اور ایک حیوان میں صرف صورت کا فرق رہ جاتا ہے۔ اس کے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اس دنیا میں کسی ایسے ضابطہ اخلاقی کا پابند رہ سکے جس کے نتائج آج نہیں، بلکہ کل ظاہر ہونے والے ہیں۔ یہی رمز ہے کہ اس ٹائپ کے لوگ داعیان حق کے نقطہ نظر سے کوئی بڑی قیمت نہیں رکھتے۔ ان کی ذہنیت مقلدانہ ذہنیت ہوتی ہے۔ یہ چلتی گاڑی پر سوار ہونے کے عادی ہوتے ہیں، خواہ وہ کسی سمت کو جاری ہو۔ یہ کفر کے ساتھی ہیں اس وجہ سے کہ کفر غالب ہے۔ اسلام کا بھی ساتھ دیں گے اگر اسلام غالب ہو جائے۔ ان کے اندر وہ مردان کار نہیں ہوتے جو حق کی طرف اپنی اندرونی کشش سے کھینچ کر آئیں، بلکہ یہ طاقت کے دباؤ سے مجبور ہو کر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے لوگوں سے جماعت کی قوت بڑھتی نہیں، بلکہ گھٹتی ہے۔ ابتدائے اسلام میں جو لوگ ایمان لائے تھے ان کی قوت کا یہ حال تھا کہ ان کا ایک فرد، دس کافروں پر بھاری تھا، لیکن جب ان مسلمانوں کے ساتھ فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں کا جم غفیر بھی شامل ہو گیا تو یہ قوت گھٹ کر صرف ایک اور دو کی نسبت رہ گئی۔

اپنے عقلی اور اخلاقی ضعف کی وجہ سے اس ذہنیت کے لوگ کبھی کسی دعوت حق پر اس

دور میں ایمان نہیں لا سکتے جس دور میں وہ کشمکشوں اور آزمائشوں سے گزر رہی ہو۔ یہ ممکن ہے کہ یہ اس کے حق میں چوری چھپے کوئی کلمہ خیر کہہ دیں، یہ بھی ممکن ہے کہ ان دل کے مخفی گوشوں میں اس کی کامیابی کی کوئی خواہش پیدا ہو جائے۔ یہ بھی متوقع ہے کہ وہ ان لوگوں کو کچھ اچھا نہ سمجھیں جو دعوت کی مخالفت میں پیش پیش ہوں، بلکہ ایسا بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ اس طرح کے لوگ کبھی کبھی دعوت حق کی مالی یا اخلاقی مدد کا حوصلہ کرلیں۔ یہ ساری باتیں ممکن ہیں، لیکن یہ بالکل ناممکن ہے کہ یہ لوگ اس بات کی ہمت کرلیں کہ ٹوٹے ہوئے تختوں کو جمع کریں، ان کو جوڑ کر کشتی بنائیں، اس کشتی کو منجدھار میں ڈال دیں اور باد مخالف سے لڑ کر اس کو ساحل مراد پر پہنچانے کی کوشش کریں۔ ان کی ذہنی حالت دعوت کے مختلف ساز گار حالات کے لحاظ سے متغیر ہوتی رہتی ہے۔ کبھی دعوت کی کامیابی کے آثار دیکھ کر ان کے دلوں میں گدگدی پیدا ہو جاتی ہے کہ آگے بڑھ کر خود بھی اس کو قبول کرلیں۔ کبھی مشکلات و مصائب دیکھ کر بالکل سہم جاتے ہیں اور دعوت کو حماقت اور داعی کو بے خرد اور مجنون قرار دینے لگتے ہیں، لیکن ایسا کم ہوتا ہے کہ معاندین کے سے جوش کے ساتھ اس کی مخالفت اور بیخ کنی پر آمادہ ہو جائیں یا کھلم کھلا اس پر ایمان لا کر اس کی حمایت و نصرت کے لیے سربکف ہو جائیں۔ یہ اس کی تباہی بھی چاہتے ہیں تو اس طرح نہیں کہ اس کو تباہ کرنے کے لیے خود انہیں کوئی خطرہ مول لینا پڑے، بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ یہ کشتی کسی چٹان سے ٹکرا کر خود بخود پاش پاش ہو جائے۔ اسی طرح اگر اس کی کامیابی کی آرزو کرتے ہیں تو اس طرح نہیں کہ اس راہ میں انہیں کوئی جوکھم برداشت کرنا پڑے، بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے اس کے لیے جان و مال کی قربانیاں کر کے اس کو پروان چڑھائیں اور یہ اس کا پھل کھائیں۔

مغفلین

مغفلین سے مراد عامۃ الناس کی وہ بھیڑ ہے جن کو اپنی روٹی اور روزمرہ کی ضروریات کی فراہمی سے کبھی اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ سوسائٹی کے بناؤ بگاڑ کے کاموں میں

قائدانہ حیثیت سے کوئی حصہ لے سکیں۔ یہ ذہنی اور معاشی، دونوں اعتبار سے اپنے وقت کے نظام کے تابع، بلکہ اس کے قلی ہوتے ہیں اور اس کے تحت جیتے رہنے ہی کو ایک بڑی نعمت اور ان لوگوں کا فضل و احسان سمجھتے ہیں جن کی قیادت میں یہ نظام چل رہا ہوتا ہے۔ یہ لوگ بالعموم ان اخلاقی مفاسد سے پاک ہوتے ہیں جن میں معاندین کا گروہ مبتلا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کسی دعوت حق کی مخالفت میں سرگرمی کے ساتھ نہ یہ حصہ لیتے اور نہ ان کے حصہ لینے کی کوئی وجہ ہے۔ لیکن یہ اپنے وقت کے دینی و سیاسی پیشواؤں کے مقلد اور مرید ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ ایک موروثی حسن ظن رکھتے ہیں اس وجہ سے کوئی ایسی بات جو ان کے ائمہ سیاست و مذہب کے مسلک کے خلاف ہو ان کے دل کو اوّلاً تو لگتی ہی نہیں اور اگر لگتی بھی ہے تو شروع شروع میں وہ اس سے بے گانگی سی محسوس کرتے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ پہلے ان کے ائمہ قدم اٹھائیں تو یہ ان کے ساتھ چلیں۔ ان کے ائمہ ان اسباب کی وجہ سے جو اوپر بیان ہوئے، موافقت کے بجائے مخالفت کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں اور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے ساتھ اپنے پیرووں کو بھی لے چلیں۔ یہ وقت ہوتا ہے کہ یہ گروہ دعوت سے واقف ہونا شروع ہوتا ہے اور درجہ بدرجہ حق و باطل کی کشمکش جتنی ہی بڑھتی جاتی ہے عامۃ الناس اتنے ہی اس سے قریب ہونا شروع ہوتے ہیں۔ اس کشمکش میں ان کو داعی کے بے لوث کیریکٹر اور اس کی دعوت کی دل پذیری کا بطور خود اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر کچھ ذہین اور اخلاقی جرأت رکھنے والے اشخاص دعوت کے حامی بن جاتے ہیں۔ وقت کے ارباب کار جب دیکھتے ہیں کہ ان کے پیرو ان کے ہاتھ سے نکل چلے ہیں تو وہ دعوت اور داعی کی مخالفت میں پوری قوت کے ساتھ میدان میں اتر آتے ہیں اور عوام کو اپنے ساتھ لگائے رکھنے کے لیے پراپیگنڈے کے سارے حربے استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ چیز اگرچہ بہتوں کو دعوت کے خلاف بدگمانیوں میں مبتلا کر دیتی ہے، لیکن اس دور میں ان لوگوں کو داعی کے اعلیٰ کیریکٹر اور اس کی دعوت کی عقلی قوت کا اپنے لیڈروں کے اخلاق اور ان کی دعوت کی قوت سے موازنہ کرنے کا اچھا موقع

ملتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ عوام اپنے سابق لیڈروں سے بدگمان اور نئی دعوت سے متاثر ہونا شروع ہوتے ہیں۔ اگرچہ دیرینہ تقلید کی بندشیں فوراً دور نہیں ہوتیں، لیکن اس گروہ کے جری اور بلند سیرت اشخاص آگے بڑھ کر حق پرستی کی راہ کھول دیتے ہیں اور یکے بعد دیگرے اس طبقہ کا ایک بڑا حصہ حق کے آغوش میں آجاتا ہے۔

باب ۱۳

دعوتِ حق کے موافقین

دعوتِ حق کے مخالفین کی طرح اس کے موافقین کی بھی تین قسمیں ہیں:

۱۔ سابقین اوّلین۔

۲۔ متبعین باحسان۔

۳۔ ضعفاء اور منافقین۔

اب ہم مختصراً ان تینوں جماعتوں کی خصوصیات وصفات پر روشنی ڈالیں گے۔

سابقین اوّلین

دعوت حق کے موافقین میں سب سے اونچا درجہ سابقین اوّلین کا ہے۔ سابقین اوّلین سے مراد وہ گروہ ہے جو کسی دعوت حق کے بلند ہوتے ہی اس کو لبیک کہتا ہے اور بے جھجک اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ ان سلیم الفطرت لوگوں کی جماعت ہوتی ہے جو دعوت سے پہلے بھی اپنے اندر وہی کچھ محسوس کرتے ہوتے ہیں جس کی دعوت ایک داعی حق دیتا ہے۔ یہ عقلی اعتبار سے اتنے بلند ہوتے ہیں کہ صرف دنیا کے ظاہر پر قناعت نہیں کرتے، بلکہ اس کے باطن کے اشارات کو بھی دیکھتے اور سمجھتے ہیں اور ان کی نگاہ میں حقیقی قدر ان باطنی حقائق کی ہوتی ہے نہ کہ ظواہر کی۔ یہ حیوانوں کی طرح مجرد خواہشوں کے بندے نہیں ہوتے، بلکہ عقل اور فطرت کے تقاضوں کو جانتے ہیں اور زندگی کے تمام مرحلوں میں انہی کو مقدم رکھتے ہیں۔ ان کی عقل اتنی قوی اور فعّال ہوتی ہے کہ وہ

باپ دادا کے رسوم اور پرانی روایات کی زنجیروں میں بندھ کر بے بس ہونا کبھی پسند نہیں کرتے۔ یہ ہر بات کے حسن وقبح کو پہنچاننے کی کوشش کرتے ہیں، اس کو نقد ونظر کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، اس کے غث وسمین میں امتیاز کرتے ہیں اور اس میں سے جس چیز کو عقل و فطرت کے مطابق پاتے ہیں اسی کو قبول کرتے ہیں۔ گروہی عصبیتوں اور جماعت تعصّبات کے بندھنوں سے یہ آزاد ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک نہ سچائی کسی خاص شخص کے دامنوں سے بندھی ہوئی ہوتی، نہ کسی خاص حلقہ اور گروہ کے اندر محصور ہوتی، اور نہ وہ جائیداد کی طرح وراثت میں منتقل ہوتی۔ یہ کسی بات کو حق ماننے کے لیے عقل وفطرت کی تصدیق کافی سمجھتے ہیں، اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ کون اس کا مخالف ہے اور کون اس کے موافق ہے۔ یہ نہ ماضی کے مرید ہوتے، نہ حاضر کے بندے، نہ اللہ کے رسولوں کے سوا کسی بڑے سے بڑے مقتدا اور پیشوا کو یہ درجہ دیتے کہ وہ بجائے خود ایک حجت اور سند بن جائے۔

اسی طرح یہ لوگ اخلاقی اور عملی اعتبار سے بھی بہت بلند ہوتے ہیں۔ ان کی عقل جس چیز کا حق ہونا ان پر واضح کردیتی ہے ان کی اخلاقی جرأت ان کو آمادہ کرتی ہے کہ اس حق کو قبول کریں اور اس کے لیے ہر خطرہ کو گوارا کریں۔ حق کی حمایت کے لیے یہ لوگ نہایت ذکی الحس ہوتے ہیں۔ ان کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ حق کو مظلومیت کی حالت میں دیکھیں اور اس کے لیے ان کا دل دردمند نہ ہو۔ یہ اپنے زمانہ کے ہر اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے خود لپکتے ہیں جس میں ان کو اجتماعی فلاح کا کوئی پہلو نظر آئے۔ ان کی غیرت اس بات کو گوارا نہیں کرتی کہ حق کی خدمت کا کوئی کام ہو رہا ہو، دوسرے اس کے لیے زحمتیں اور مصیبتیں جھیل رہے ہوں، جان و مال کی قربانیاں پیش کر رہے ہوں اور وہ محض ایک خاموش تماشائی کی طرح اس کو دیکھ کر گزر جائیں، یا محض دور سے دو حرف تحسین وآفرین کے کہہ کر اس پر قانع ہو جائیں۔ بلکہ یہ اس کو برپا کرنے کے لیے خود اٹھتے اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کے لیے خود سبقت کرتے ہیں۔ یہ برے سے برے ماحول کے اندر اچھی اور بااخلاق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے

لیے اپنے زمانہ کی جاہلیت سے برابر کش مکش کرتے رہتے ہیں۔ جہاں سب کے ہاتھ ظلم اور ناانصافی سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہاں یہ عدل وانصاف کے کام کرتے ہیں۔ جہاں یتیموں کے حق مارا جاتا ہے، جہاں لڑکیاں زندہ درگور کی جاتی ہیں، جہاں بیواؤں کو بے یارو مددگار چھوڑا جاتا ہے۔ وہاں یہ یتیموں کا حق دیتے ہیں، ظالم باپوں کو بیٹیوں کی اپنے خرچ پر پرورش کرتے ہیں، بیواؤں کی خدمت کرتے ہیں۔ جہاں سب جوئے شراب، زنا، رہزنی اور غارت گری کو ہنر سمجھتے ہیں اوران پر فخر کرتے ہیں۔ وہاں یہ فیاضی، خدمت خلق مہمان نوازی، غربا پروری، حمایت مظلوم اور دوسرے مکارم اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان میں استکبار کی جگہ تواضع اور حق پسندی کا جذبہ ہوتا ہے، حسد کی جگہ راہِ حق میں تنافس اور مسابقت کا ولولہ ہوتا ہے، خودغرضی اور مفاد پرستی کی بجائے ایثار اور خدمت خلق کا جوش ہوتا ہے۔ یہ اس بات کو بڑی دنائت کی بات سمجھتے ہیں کہ آدمی ایک نظام کو حق مانتے ہوئے اس کی حمایت سے محض اس وجہ سے جی چرائے کہ اس کا ساتھ دینے میں دنیا کی لذتوں اور راحتوں کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ اس بات کو بھی نہایت رذالت کی بات سمجھتے ہیں کہ آدمی ایک چیز کو باطل تسلیم کر رہا ہو، لیکن اس کے ساتھ محض اس وجہ سے چمٹا ہوا رہے کہ اس باطل سے اس کا کوئی دنیوی مفاد وابستہ ہے۔ ان کی مردانہ غیرت پر یہ چیز بڑی شاق گزرتی ہے کہ ایک امر حق کا ساتھ محض اس وجہ سے نہ دیا جائے کہ اس کی وجہ سے کوئی خسارہ برداشت کرنا پڑ رہا ہے، یا یہ کہ باطل بڑا طاقتور ہے اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، یا زمانہ کے حالات بہت ناسازگار ہیں اوران ناسازگار حالات میں حق کا نام لینا خطرات ومصائب کو دعوت دینا ہے۔ اس طرح کے وسوسے ان کے غیور اور باہمت دلوں میں اوّل تو پیدا نہیں ہوتے اور اگر پیدا بھی ہوتے ہیں تو ان کی بلند ہمتی جلد ان کو دور کر کے ازسرنو اس کام کے لیے ان کو آمادہ کر دیتی ہے جس کی پکار ان کے دل کی گہرائیوں سے اٹھتی رہتی ہے۔

اس طرح کا ایک پاکیزہ گروہ ہر عہد کے جاہلیت کی اندر موجود رہتا ہے۔ برسات

کی اندھیری راتوں میں جس طرح جگنو چمکتے ہوتے ہیں اسی طرح اپنے زمانہ کی عام ظلمت کے اندر یہ لوگ چمکتے ہوتے ہیں اور ان کے دم سے ان کے زمانہ میں رشنی کی ایک نمود باقی رہتی ہے۔ لیکن ان کی قوتیں منتشر ہوتی ہیں اس وجہ سے ان کو منظّم کرنے اور ایک وحدت میں پرونے کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی بندۂ حق اٹھے اور ان سب کو ایک مرکز پر مجتمع کردے۔

اپنی ان تمام خوبیوں اور صلاحیتوں کے باوجود یہ دو وجہوں سے ایک داعی حق کے محتاج ہوتے ہیں۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کے زمانہ میں حق اپنی مجموعی شکل میں موجود ہی نہیں ہوتا، صرف اس کے کچھ اجزاء ہوتے ہیں جیسا کہ انبیاء کے وقفہ کے زمانہ میں ہوتا ہے۔ ایسے زمانوں میں صالحین کا یہ گروہ ایک درماندگی اور پریشانی کی حالت میں مبتلا رہتا ہے۔ یہ لوگ دنیا کی عام خرابی کو دیکھ کر اس سے کڑھتے تو رہتے ہیں، لیکن یہ نہیں جانتے کہ اس خرابی کی اصلاح کس طرح کریں۔ یہ اپنے زمانہ کی برائیوں سے حتی الامکان اپنے آپ کو الگ تو رکھتے ہیں، لیکن نیکی اور سعادت کی شاہراہ خود ان کے سامنے بھی نہیں ہوتی، چہ جائیکہ دوسروں کو اس پر چلنے کی دعوت دے سکیں۔ یہ محسوس تو کرتے ہیں کہ بندگی اور اطاعت کا تنہا حقدار صرف اللہ ہی ہے، لیکن خدا کی بندگی کا طریقہ نہ انہیں خود معلوم ہوتا ہے اور نہ اس کے معلوم کرنے کا ان کے پاس کوئی ذریعہ ہی ہوتا۔ اسی گروہ کے افراد تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے قریش کے دین جاہلیت سے بیزار ہو کر اپنے طور پر اللہ کی عبادت کرتے تھے اور خانہ کعبہ کی دیواروں سے لگ کر نہایت حسرت سے کہا کرتے تھے کہ ''اے خدا! ہمیں نہیں معلوم کہ تیری عبادت کا طریقہ کیا ہے، ورنہ ہم اسی طرح تیری عبادت کرتے''۔ ان کے اندر بعض بلند پایہ شاعر تھے جن کا رنگ شاعری ان کے زمانہ کی عام اوباشانہ شاعری سے اس قدر الگ تھا کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اشعار سن کر تعریف فرمائی ''کہ یہ شخص مسلمان ہوتے ہوتے رہ گیا''۔ ان میں بلند رتبہ خطیب بھی

تھے جن کے خطبات آج بھی موجود ہیں۔ ان کو پڑھ کر ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ انہوں نے حقیقت کے دروازہ پر دستک ضرور دے دی تھی اگرچہ اس دروازہ کو کھول نہ سکے۔ ان میں ورقہ بن نوفل، عبداللہ بن جحش، عثمان بن حویرث، زید بن عمرو بن نفیل جیسے جری لوگ تھے جو علی الاعلان کہتے تھے کہ "یہ کیا بے ہودہ پن ہے کہ ہم ایک پتھر کے سامنے سر جھکاتے ہیں جو نہ سنتا ہے، نہ دیکھتا ہے، نہ کسی کا نقصان کرسکتا ہے، نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے"۔ یہ لوگ حق کی تلاش میں تھے، لیکن ان کے زمانہ میں پورا حق موجود ہی نہیں تھا اس وجہ سے یہ محتاج تھے کہ کوئی حق بتانے والا آئے اور ان کی رہنمائی کرے۔ چنانچہ جونہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپ نے دعوت حق بلند کی اس طرح کے تمام حق کے طالب جو آپ کے زمانہ میں موجود تھے، آپ کے اردگرد اکٹھے ہوگئے۔ یہ حق کی لذت سے آشنا تھے اس وجہ سے حق کو پہچاننے میں ان کو کوئی زحمت پیش نہیں آئی۔ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات اپنے ہی دل کی بات معلوم ہوئی۔ یہ ایک راست باز اور کذاب میں آسانی سے امتیاز کرسکتے تھے اس وجہ سے آپ کی پاکیزہ سیرت کو دیکھنے کے بعد ان کو گمان بھی نہیں گزرا کہ یہ شخص جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ وہ آپ کی آواز اور آپ کے چہرہ سے آپ کی نبوت کو پہچان گئے اور پکار اٹھے:

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا

(ال عمران ۳: ۱۹۳)

"اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا ایمان کی دعوت دیتے کہ لوگو! اپنے رب پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لائے۔"

چونکہ یہ لوگ اس حق کے لیے منتظر اور چشم براہ تھے اس وجہ سے اس کو پا کر انہوں نے بحثیں اور حجتیں نہیں کھڑی کیں، بلکہ اس کو دیکھ کر ان کے دلوں کا وہی حال ہوا جو اپنے کسی گم گشتہ عزیز کو مدتوں کے بعد پا کر کسی شخص کا ہوتا ہے:

وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ﴿۸۳﴾ (المائدۃ ۵:۸۳)

"اور جب یہ سنتے ہیں اس چیز کو جو رسول کی طرف اتاری گئی ہے تو تم دیکھو گے کہ حق کو پہچان لینے کے سبب سے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے، تو ہمیں اس کی گواہی دینے والوں میں لکھ۔"

ان کے انتشار اور بے نظمی کی دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ حق تو ان کے سامنے موجود ہوتا ہے، وہ اس کے مطالبات اور ذمہ داریوں کو سمجھنے کے لیے کسی نبی کی بعثت اور کسی کتاب کے اتارے جانے کے محتاج نہیں ہوتے۔ لیکن ان کی رہنمائی کے لیے کوئی ایسا لیڈر موجود نہیں ہوتا جو ان کی پراگندہ قوتوں کو ایک راہ پر لگا دے۔ ایک بگڑے ماحول کے اندر، جب کہ جاہلیت رات کی عالمگیر تاریکی کی طرح چھا چکی ہو، یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ راہ حق یہ ہے، ہر شخص کی ہمت نہیں ہے کہ وہ قافلوں کی رہنمائی اور قوموں کی رہبری کی ذمہ داری لینے کے لیے ازخود پیش قدمی کرے۔ لیڈری اور امامت کے دلدادہ تو بے شک اندھے ہونے کے باوجود دوسروں کو راہ دکھانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، لیکن صالح لوگ، جو قیادت وامامت کے خیر وشر کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، حتیٰ الامکان یہی کوشش کرتے ہیں کہ اس کارِ عظیم کی ذمہ داریوں سے اپنے تئیں بچائے جائیں۔ وہ اپنی خداترسی اور احساسِ ذمہ داری کی وجہ سے اوّل تو اپنے آپ کو تولنے میں نہایت منصف ہوتے ہیں اور اگر اس تول میں کوئی غلطی کرتے بھی ہیں تو وہ غلطی اپنے نفس کی جانبداری میں نہیں ہوتی کہ اپنے ہی پلڑے کو جھکا ہوا رکھنے کی کوشش کریں، بلکہ اس کے برعکس غایت احتیاط کی وجہ سے وہ اپنا اندازہ اپنی حیثیت سے کم ہی کرتے ہیں۔ اپنا اندازہ اپنی حیثیت سے گھٹا کر کرنا احتیاط اور تقویٰ کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ نااہل اور ناکارہ اشخاص امارت وسیادت کے جتنے خواہشمند ہوتے ہیں، اہل اور لائق اشخاص اسی قدر اس سے خائف اور ترساں رہتے ہیں۔ حضرت

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں سے ہر ایک نے سقیفہ بنی ساعدہ میں جس طرح اپنے آپ کو خلافت کی ذمہ داریوں سے بچانے کی کوشش کی اس کی تفصیلات بھی ہمارے سامنے ہیں اور خلافت راشدہ کے بعد کے زمانوں میں اسی چیز کے لیے نااہلوں اور بوالہوسوں نے جس طرح ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرائیاں اور خوں ریزیاں کیں وہ بھی ہمارے علم میں ہیں۔ یہ واضح ثبوت ہے اس بات کا کہ جن لوگوں کے اندر خدا ترسی ہوتی ہے وہ حتی الوسع کوشش یہی کرتے ہیں کہ آگے چلنے کی ذمہ داری کوئی دوسرا اٹھائے۔ یہ احساس فی نفسہٖ نہایت مبارک ہے، لیکن اس کی ایک خاص حد ہے جس سے اگر وہ آگے بڑھ جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صالحین پر انفرادی نیکی کا تصور غالب آ جاتا ہے اور اقامت حق کے لیے اجتماعی جدوجہد برپا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال کو خدا کے وہ بندے گوارا نہیں کر سکتے جو اجتماعی جدوجہد کے فرض کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس طرح کی انفرادی نیکیوں اور پراگندہ اور مبہم کوششوں سے دین حق کے مطالبات پورے نہیں ہو سکتے۔ یہ احساس جب کسی شخص پر اتنا غالب ہو جاتا ہے کہ وہ اس احساس کو مغلوب نہیں کر سکتا تو وہ اللہ کا نام لے کر خود اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اقامت دین کی جدوجہد کے لیے اذان دے دیتا ہے۔

یہ اذان ان سارے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے جو نماز باجماعت کے لیے پہلے سے منتظر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اس سے اس بات پر جھگڑا نہیں کرتے کہ تو نے اذان کیوں دے دی، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اذان کا وقت کب کا ہو چکا ہے۔ وہ اس بات پر حسد سے جلتے بھی نہیں کہ یہ کام اسی نے کیوں کیا انہوں نے خود کیوں نہ کیا۔ بلکہ اس کے شکر گزار ہوتے ہیں کہ اس نے وہ کام کر دیا جس کے انتظار میں وہ صرف بستروں پر کروٹیں بدلتے رہے تھے، اٹھنے کی ہمت نہ کر سکے تھے۔ وہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ یہ کوئی کامل العیار متقی اور شب زندہ دار زاہد ہے یا نہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ تمام زاہدان شب زندہ دار اور متقیان کامل العیار سوتے رہے اور وقت کا فرض پہچاننے کی توفیق اسی کو ہوئی۔ وہ اس امر پر بھی نہیں

غور کرتے کہ اس نے جس طرح آج کا کام کر دیا ہے کل کا کام بھی کر سکے گا یا نہیں، بلکہ توقع رکھتے ہیں کہ جس طرح اس نے آج کا کام انجام دے دیا ہے اسی طرح کل کے کام کو بھی انجام دینے کی توفیق پائے گا اور اگر نہیں پائے گا تو اللہ تعالیٰ کل کے کاموں کے لیے کسی اور بندے کو اٹھائے گا۔ وہ کس گروہ سے ہے؟ کس درس گاہ کا فاضل ہے؟ اس کا ماضی کیا رہا ہے؟ یہ سارے سوالات ان کے نزدیک خارج از بحث ہیں، اس لیے کہ حقیقت گروہوں اور درس گاہوں کی جائیداد نہیں ہے۔ اور جو حاضر کے فرض کو پہچان چکے ہیں ان کے پاس ماضی کے بخیے ادھیڑنے کی فرصت نہیں۔ اس طرح کے صاف ذہن رکھنے والے لوگ، جو پہلے سے اعلائے کلمہ حق کا داعیہ رکھتے ہیں، وہ وقت کی اس دعوت میں اپنے درد کی دوا اور اپنی خلش کی شفا پاتے ہیں اس وجہ سے فوراً اس کو قبول کر لیتے ہیں اور اس کو کامیاب بنانے کی جدوجہد میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔

اس گروہ میں ہر طبقہ کے افراد ہوتے ہیں۔ امیر بھی اور غریب بھی، جاہل بھی اور عالم بھی، شہری بھی اور دیہاتی بھی، نوجوان بھی اور بوڑھے بھی، عورتیں بھی اور مرد بھی، لیکن ان میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوتا جو اخلاق کے اعتبار سے کبھی پست رہا ہو۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر اپنے اوصاف کے لحاظ سے پہلے سے ممتاز اور اپنے حلقہ میں دوسروں کا اعتماد حاصل کیے ہوئے ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو جمع کرنے کے لیے داعی کو کوئی بڑی جدوجہد نہیں کرنی پڑتی، بلکہ یہ ہر گوشہ سے خود کھینچ کھینچ کر داعی کے پاس اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ داعی ان کو تلاش نہیں کرتا، بلکہ یہ داعی کو خود تلاش کر لیتے ہیں۔ یہ پیاسے ہوتے ہیں اس وجہ سے یہ نہیں چاہتے کہ دریا ان کے پاس جائے، بلکہ دشت وجبل کو طے کر کے یہ خود چشمہ کے پاس پہنچتے ہیں۔ ان کی فطرت کا شفاف روغن بغیر اس کے کہ اس کو آگ چھوئے، بھڑکنے کے لیے مستعد ہوتا ہے اس وجہ سے دیا سلائی کے دیکھتے ہی جل اٹھتا ہے۔ یہ معجزے اور کرشمے نہیں طلب کرتے، نام ونسب اور شجرہ نہیں دریافت کرتے، لاطائل بحثیں اور حجتیں نہیں کھڑی کرتے، صرف یہ دیکھتے ہیں کہ داعی جس بات کے لیے پکار رہا ہے وہ حق ہے یا نہیں

اور اسی راہ پر وہ خود بھی گامزن ہے یا نہیں؟ اگر اس پہلو سے ان کا اطمینان ہوگیا تو وہ پوری دلجمعی کے ساتھ اس کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ آئندہ کے موہوم خطرات کی بنا پر آج کی ایک واضح حقیقت کو نہیں جھٹلاتے۔ وہ اس بات پر اطمینان رکھتے ہیں کہ جس عقل سے آج حق و باطل میں امتیاز کر کے وہ حق کا ساتھ دے رہے ہیں وہ عقل کل بھی ان کے پاس حق و باطل میں امتیاز کے لیے موجود ہوگی۔ اگر وہ دیکھیں گے کہ کسی مرحلہ میں داعی کی راہ، حق کی شاہرہ سے منحرف ہو رہی ہے تو وہیں سے اس سے کٹ کر اپنی منزل کھوٹی کیے بغیر، وہ حق کی شاہراہ پر اپنا سفر شروع کر دیں گے۔

متبعین باحسان

دعوتِ حق کے قبول کرنے والوں کا دوسرا طبقہ متبعین باحسان کا طبقہ ہے۔ اس سے مراد وہ گروہ ہے جو سابقین اوّلین کو دیکھ کر حق کی طرف بڑھتا ہے۔ یہ لوگ عقلی اور اخلاقی اعتبار سے سابقین اوّلین کے درجہ کے نہیں ہوتے اس وجہ سے اپنی ذاتی تحریک (INITIATIVE) سے کوئی بڑا قدم نہیں اٹھا سکتے اور کسی نئی راہ میں چلنے کے لیے پہل کرنے سے گھبراتے ہیں۔ ان لوگوں کے اندر قیادت کی صلاحیت نہیں ہوتی اس وجہ سے دعوت حق کی عقلی اور استدلالی قوت ان کو اتنا نہیں متاثر کرتی جتنا اس کو قبول کرنے والے پیشرووں کی ہمت و جرأت ان کو متاثر کرتی ہے۔ یہ جب دیکھتے ہیں کہ کوئی دعوت حق اٹھی ہے، اس کو کچھ لوگوں نے ہمت کر کے قبول کرلیا ہے، اس کو وہ لے کر آگے بڑھ رہے ہیں اور اس کو دنیا میں برپا کرنے کے لیے وہ ہر قسم کے خطرات جھیل رہے ہیں اور آئندہ جھیلنے کو تیار ہیں تو یہ منظر ان کے دلوں کو متاثر کرتا ہے اور وہ بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے اپنی ہمت و قوت کو آزمانے لگتے ہیں۔ ان لوگوں کی استعدادیں مختلف درجہ کی اور ان کی رکاوٹیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں اس وجہ سے اس کشمکش میں کچھ عرصہ لگ جاتا ہے۔ لیکن داعیان حق کی لگاتار جدوجہد اور پیش آنے والی مشکلات میں ان کا صبر و استقلال دیکھتے دیکھتے بالآخر ان

کے دلوں کا زنگ بھی صاف ہو جاتا ہے اور وہ ہمت کر کے یکے بعد دیگرے باطل سے ٹوٹ ٹوٹ کر حق کی صفوں میں آ ملتے ہیں۔

یہ لوگ اگر چہ دعوت حق کا ساتھ سابقین اوّلین کی دیکھا دیکھی دیتے ہیں، لیکن جب ساتھ دیتے ہیں تو پورا ساتھ دیتے ہیں، کسی قسم کی کمزوری، ہچکچاہٹ، بزدلی، تھڑ دلے پن اور نفاق کا اظہار نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عقلی اور اخلاقی اعتبار سے صف اوّل کے نہ سہی، لیکن صف دوم کے بہترین آدمی ہوتے ہیں۔ یہ اپنی خودی کے ضعف کی وجہ سے اپنے عہد کی جاہلیت سے متاثر اور مرعوب ضرور ہو جاتے ہیں لیکن ان کے اندر حق کا شعور مردہ نہیں ہو چکا ہوتا ہے اس وجہ سے نظامِ باطل کی گاڑی جب تک کھینچتے ہیں انقباض وتکدر کے ساتھ کھینچتے ہیں اور اپنے دل کی گہرائیوں میں حق کی حمیت محسوس کرتے رہتے ہیں۔ نظامِ باطل سے ان کا یہ انقباض کبھی دب جاتا ہے، کبھی ابھر آتا ہے، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ وہ یک قلم معدوم ہو جائے۔ بلا شبہ اپنے ماحول سے لڑ کر اس کو بدلنے کی ہمت ان کے اندر نہیں ہوتی اس وجہ سے ان کو اپنے عہد کے نظامِ باطل پر قانع رہنا پڑتا ہے، لیکن ان کی اس قناعت کی تہ میں ایک خلش دبی ہوئی ہوتی ہے جو اس وقت لازماً ابھر آتی ہے جب ان کے سامنے کوئی دعوت حق آتی ہے۔ یہ خلش جب بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ ان کی برداشت سے باہر ہو جاتی ہے تو ہمت کر کے اسی راہ پر وہ خود بھی چل کھڑے ہوتے ہیں جس راہ پر وہ دوسرے کچھ حق پرستوں کو گامزن دیکھتے ہیں۔ چونکہ ان کا یہ آنا اپنے ارادہ سے ہوتا ہے، نہ کہ کسی کے دباؤ سے، اور چونکہ ان کا یہ اقدام ان کی حمیت کے تقاضے سے وجود میں آتا ہے، نہ کہ کسی پوشیدہ خودغرضی کی تحریک سے۔ اس وجہ سے عزم وبصیرت کا وہ زادِراہ ان کے پاس موجود ہوتا ہے جو آئندہ مراحل ومشکلات میں ان کے ایمان کی حفاظت کرتا ہے اور کسی بڑی سے بڑی آزمائش میں بھی ان کے پاؤں لڑکھڑانے نہیں دیتا۔

ان لوگوں کو حق کی طرف کھینچنے کے لیے داعی حق کو محنت اٹھانی پڑتی ہے۔ یہ لوگ، جیسا

کہ او پر ظاہر کر چکے ہیں، نہ عقلی اعتباری ہی سے اتنے بلند ہوتے ہیں کہ حق کا پورا تصور بغیر عملی مثالوں کے ان کی گرفت میں آ جائے اور نہ اخلاقی اعتبار ہی سے اتنے بلند ہوتے ہیں کہ اس کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اگر چہ ان کے سایہ کے سوا کوئی بھی ان کے داہنے بائیں نہ ہو۔ ان کی ان دونوں کمزوریوں کی وجہ سے لازماً داعی کو ان کے ساتھ کچھ دنوں تک کشمکش کرنی پڑتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ اس بات کے محتاج ہوتے ہیں کہ حق ان کے سامنے ایسی وضاحت کے ساتھ کھول دیا جائے کہ اس کا کوئی پہلو گنجلک اور مبہم نہ رہ جائے۔ جو شبہات خود ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں ان کو بھی دور کر دیا جائے اور جو شکوک دوسروں کے پیدا کرنے سے پیدا ہو سکتے ہیں، حتی الامکان ان کو بھی دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہاں تک کہ عقلی اعتبار سے ان کا دل پوری طرح دعوت کی سچائی پر جم جائے۔ جب یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے تو ان کی اخلاقی جرأت کو شہ دینے کے لیے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کے سامنے عزم و ہمت کی مثالیں آئیں۔ یہ مثالیں ان کے دل کی قوت کو بڑھاتی ہیں، ان کے تردد اور جھجک کو دور کرتی ہیں، مخالف ماحول میں ان کو راہ حق پر چلنے کا طریقہ بتاتی ہیں، یہاں تک کہ ان کی عقل اور ان کا ضمیر، دونوں پوری طرح زندہ اور بیدار ہو جاتے ہیں اور پھر اللہ کی توفیق اگر سہارا دیتی ہے تو وہ راہِ حق پر چلنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔

ضعفاء اور منافقین

ضعفاء اور منافقین کو ہم نے محض ظاہری مشابہت کی وجہ سے ایک ہی زمرہ میں رکھا ہے، لیکن اپنی نیت و ارادہ کے اعتبار سے یہ دو الگ الگ جماعتیں ہیں، اس وجہ سے ہم یہاں ان دونوں کی صفات و خصوصیات پر مختصراً علیحدہ علیحدہ بحث کریں گے۔

ضعفاء سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کو حق سمجھ کر قبول تو کر لیتے ہیں اور نیتۃً اسی حق کے مطابق زندگی بھی بسر کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان کی قوت ارادی کمزور ہوتی ہے، اس وجہ سے

خلوصِ نیت کے باوجود راہِ حق میں لڑکھڑاتے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے چلتے ہیں۔ یہ لوگ بار بار گرتے اور اٹھتے ہیں، لیکن ہر گرنے کے بعد ان کا اٹھنا راہِ حق پر چلنے ہی کے لیے ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ گریں تو پھر اٹھنے کا نام ہی نہ لیں، یا اٹھیں تو اٹھ کر حق کے بجائے باطل ہی کی راہ پر دوڑ پڑیں۔ یہ لوگ اپنی تقصیر کے معترف اور اس پر نادم وشرمسار ہوتے ہیں اور برابر توبہ واستغفار سے اس کا ازالہ کرتے رہتے ہیں۔ ذہن اور نیت کے اعتبار سے یہ فروتر نہیں ہوتے، اس وجہ سے ان میں بہتیرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو دعوت کے بالکل ابتدائی دور میں اس کو قبول کرنے کی ہمت کر لیتے ہیں، لیکن آزمائش کے موقعوں پر ان کی قوت ارادی کا ضعف نمایاں ہوتا رہتا ہے اور شروع سے آخر تک یہ برابر تربیت واصلاح کے محتاج رہتے ہیں۔ سورۂ توبہ میں انہیں لوگوں کی طرف اشارہ ہے:

وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾ (التوبۃ ۹:۱۰۲)

”اور کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیا ہے۔ انھوں نے کچھ نیکیاں اور کچھ بدیاں ساتھ ہی دونوں کمائی ہیں۔ امید ہے کہ اللہ ان پر رحمت کی نظر کرے۔ اللہ غفور رحیم ہے۔“

ان لوگوں کے اندر ہمت واستقامت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی قوت ارادی کے ضعف کے اسباب کی اچھی طرح تحقیق کر کے ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر اس ضعف کا سبب ذہنی اور عقلی ہے تو ان کو اللہ کی صفتوں، ان کی قدرتوں اور حکمتوں، اور اس کے ان ضابطوں سے آگاہ کیا جائے جن کے مطابق وہ اپنی راہ پر چلنے والوں کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ اگر اس میں طمع دنیا کو دخل ہے تو ان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا عادی کیا جائے تاکہ یہ بیماری دور ہو۔ اگر جان کی محبت اور موت کا خوف غالب ہے تو ان پر موت کی قطعیت اور اہل حق کے لیے حسن عاقبت کا پہلو اچھی طرح واضح کیا جائے۔ یہ گروہ تعلیم وتربیت سے فائدہ ضرور اٹھاتا ہے، اس وجہ سے اگرچہ کمزور قوت

ارادی کے باعث ان کی رفتار ترقی سست ہو، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی جگہ ہی جمے رہ جائیں اور تربیت سے کوئی فائدہ حاصل نہ کریں۔ انہی لوگوں کے بارہ میں ارشاد ہے:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾

(التوبۃ ۹: ۱۰۳)

''تم ان کے مالوں کا صدقہ قبول کرلو۔ اس سے تم ان کو پاکیزہ بناؤ گے اور ان کا تزکیہ کرو گے۔ اور ان کے لیے دعا کرو۔ بے شک تمہاری دعا ان کے لیے سرمایہ تسکین ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔''

منافقین کا گروہ زبانی اقرار کی حد تک تو دعوت حق کا ساتھی ہوتا ہے، لیکن ان کا دل باطل کے ساتھ ہوتا ہے، کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ محض کسی عارضی تاثر سے یہ حق کے ساتھ ہو جاتے ہیں، پھر جب راہ حق کی صعوبتیں اور آزمائشیں آتی ہیں تو اپنی اس غلطی پر پچھتاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جہاں سے آئے ہیں وہیں واپس چلے جائیں، لیکن محض جھوٹی شرم کی وجہ سے حق کے ساتھ مجبورانہ بندھے رہتے ہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ حق کی طرف آتے ہی شرارت کے ارادہ سے ہیں تا کہ اہل حق کے کیمپ کے اندر گھس کر فساد کے مواقع تلاش کریں۔ محض دکھاوے کے لیے حق کے ہمدرد و ہوا خواہ بن جاتے ہیں، حقیقت میں دشمنوں کے ایجنٹ ہوتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ حق کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر اس سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور اپنے دنیاوی فوائد کی خاطر کچھ ظاہری لگاؤ اس کے ساتھ بھی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ اور اسی طرح کے بعض دوسرے محرکات و اسباب ہیں جن کی وجہ سے یہ حق کا اظہار تو کر دیتے ہیں اور ممکن حد تک اس بات کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ اس اظہار کو نباہتے ہیں، لیکن قدم قدم پر ان کی غلطیاں اور شرارتیں حقیقت کے چہرے کو بے نقاب کرتی رہتی ہیں۔

ایک داعی حق کے کام کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والا گروہ یہی ہے۔ کھلے ہوئے

مخالفین کی مختلف جماعتوں میں سے کوئی جماعت بھی دعوت حق کے لیے اس درجہ خطرناک نہیں ہے جس درجہ درپردہ مخالفت کرنے والے ''ہمدردوں'' کی جماعت ہے۔ یہ اپنے بن کر بے گانوں کے مقصد کو پورا کرتے ہیں اور ایسی خوبی اور صفائی کے ساتھ پورا کرتے ہیں کہ کوئی دوسرا اس خوبی اور صفائی کے ساتھ پورا نہیں کرسکتا۔ یہ داعی اور دعوت کے خلاف لوگوں میں بے شمار قسم کی غلط فہمیاں پھیلاتے ہیں اور چونکہ اپنے سمجھے جاتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اخلاص و ہمدردی کے رنگ میں کہتے ہیں اس وجہ سے لوگ ان کے پھیلائے ہوئے فتنوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہ جماعت کے درمیان ہمیشہ پھوٹ ڈالنے کے درپے رہتے ہیں اور ہر اس چنگاری کو دبا کر محفوظ رکھتے ہیں جس کو وقت پر ہوا دے کر اس سے فتنہ کی آگ بھڑکائی جاسکے۔ یہ جماعت کے اندر اس کے دشمنوں کے ایجنٹ ہوتے ہیں، ان کے مقاصد کی تکمیل کے لیے اڈے بناتے ہیں اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ یہ خدمت حق کے لیے بنائے گئے ہیں۔ یہ حق کے دشمنوں سے حق کی مخالفت کے ارادے سے ساز باز رکھتے ہیں اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ وہ محض ہمدردی اور خیر خواہی کی نیت سے کر رہے ہیں۔ ہر وہ بات جو اہل حق کے لیے حوصلہ شکن ہو ان کو دل سے بھاتی ہے اور اس کی شہرت دینے میں ان کو خاص مزہ آتا ہے۔ اس کے برعکس وہ ساری باتیں جو اہل حق کی ہمت افزائی کرنے والی ہوں ان کے لیے غم انگیز اور مایوس کن ہوتی ہیں۔ ان کو راہ حق میں ہر قدم پر خطرہ ہی خطرہ نظر آتا ہے اور جماعتی خیر خواہی کے رنگ میں ان کی کوشش برابر یہ رہتی ہے کہ ان خطرات کی ہیبت ہر دل کے اوپر بٹھا دیں۔ یہ اپنی بزدلی اور خست کو چھپانے کے لیے طرح طرح کی تدبیروں سے دوسروں کے جذبہ فیاضی و قربانی کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حق کے غلبہ کی طرف سے یہ ہمیشہ مایوس رہتے ہیں اور مستقبل کے پردوں میں ان کے نزدیک حق کے لیے مصیبت اور تباہی کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں۔ عملی اعتبار سے یہ لوگ محض صفر ہوتے ہیں، اس وجہ سے جماعت کے اندر اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے بے ثبوت دعادی، جھوٹی قسموں اور چکنی چپڑی باتوں کو ذریعہ بناتے ہیں۔ حق کی ہر کامیابی کو یہ لوگ

حاسدانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اگر خدانخواستہ اہل حق کو کوئی افتاد پیش آجائے تو اس سے ان کے دل کو ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔

یہ گروہ چونکہ سارا فساد، قصد و ارادہ کے ساتھ پھیلاتا ہے، اس وجہ سے اصلاح قبول کرنے کی صلاحیت اس میں بہت کم ہوتی ہے۔ اس کے اندر اصلاح صرف وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو محض کسی عارضی اور وقتی غفلت کی وجہ سے دوسروں کی منافقانہ سازشوں میں پڑ کر کوئی منافقانہ حرکت کر بیٹھتے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کے سامنے جب اصل حقیقت آتی ہے تو وہ ضرور اپنی غلطی پر نادم ہوتے ہیں اور اپنے رویہ کو درست کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں، لیکن جو شریر شرارت ہی کو کیش و مشرب بنا لیتے ہیں اور اپنے اس پیشہ میں پوری طرح ماہر و مشاق ہو جاتے ہیں وہ اصلاح کی ہر کوشش کو ناکام کر دیتے ہیں اور اپنے رویہ میں کوئی تبدیلی بھی قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ ان لوگوں کے بارہ میں ایک داعی کے لیے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ جماعت کو ان کے فتنوں سے محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کرے اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ جب تک ان کے تعلیم و تزکیہ کو جماعت کے تعلیم و تزکیہ کا ذریعہ بنا سکے اس وقت تک ان کو جماعت کے اندر گھلے ملے رہنے کی اجازت دے اور جب یہ مقصد پورا ہو جائے تو ان کو فوراً جماعت سے کاٹ کر علیحدہ کر دے اور پھر کسی شکل میں بھی جماعت کے ساتھ ان کا کوئی رشتہ باقی نہ رہنے دے۔

باب ۱۴

دعوتِ حق کے مراحل

ہر دعوت حق کو کامیابی کی آخری منزل تک پہنچنے کے لیے بالعموم[۱] تین مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے:

۱۔ دعوت۔

۲۔ ہجرت۔

۳۔ جنگ۔

اس زمانہ میں لوگ زیادہ تر صرف یورپ، امریکہ، روس اور ترکیہ ہی وغیرہ کے انقلابات سے واقف ہیں اس وجہ سے سمجھتے ہیں کہ جو مرحلے ان انقلابات میں پیش آئے ہیں وہی ہر انقلاب میں پیش آتے ہیں اور جو طریقے ان انقلابات میں آزمائے جا چکے ہیں وہی ہر انقلاب میں کارگر ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک غلط فہمی ہے جس میں لوگ محض اس وجہ سے مبتلا ہیں کہ ان کے سامنے خالص اسلامی طرز کے کسی انقلاب کی تاریخ نہیں ہے، ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ حضرات انبیائے کرام یا ان کے طریق پر کام کرنے والوں کی رہنمائی میں جو انقلاب برپا ہوتے ہیں ان کی خصوصیات ان انقلابات کی خصوصیات سے بالکل مختلف ہیں جو مجرد سیاسی طرز کی تحریکات سے برپا ہوا کرتے ہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہم خالص اسلامی انقلاب کے مختلف مدارج اور اس کے ہر درجہ کی خصوصیات اور تقاضوں پر

---

۱ یہ "بالعموم" کا لفظ خاص طور پر پیش نظر رہنا چاہیے۔ ہر دعوت حق کو کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے ان تینوں مرحلوں سے گزرنا لازمی ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ عام طور پر یہ تینوں مرحلے پیش آتے ہیں، ورنہ اس جمہوریت کے زمانہ میں اس بات کا بھی امکان ہے کہ صرف پہلا مرحلہ ہی دعوت کو کامیابی سے ہمکنار کردے۔

یہاں بالا جمال گفتگو کریں گے۔

پہلا مرحلہ ـــــــــ دعوت

پہلا مرحلہ، دعوت کا مرحلہ ہے۔ ابتدا میں دعوت کا خطاب جس طبقہ کی طرف ہوتا ہے وہ اربابِ اقتدار کا طبقہ ہے۔ لیکن یہ طبقہ اپنی حالت پر بالکل مطمئن اور اپنی دلچسپیوں میں نہایت مگن ہوتا ہے، اس وجہ سے شروع شروع میں یہ لوگ دعوت کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے۔ داعی ہر پہلو سے وقت کے نظامِ فکر، وقت کے نظامِ اخلاق، اور وقت کے نظامِ سیاست و معاشرت کی غلطیوں کی نشاندہی کر کے اس انجام کو سامنے لاتا ہے جس سے بالآخر اس باطل نظام کو دوچار ہونا ہے۔ لیکن بظاہر یہ گاڑی تیزی سے چل رہی ہوتی ہے، اس وجہ سے وقت کے اربابِ کار کے لیے یہ باور کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اس گاڑی کے دھرے ٹوٹے ہوئے ہیں اور یہ جلد کسی کھڈ میں گر کر رہے گی۔ جب ظاہری حالات سازگار ہوں تو غافلوں کو کسی نظام کی باطنی کمزوریوں سے متنبہ کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ وہ اپنی غفلت و سرمستی کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اپنی کمزوریوں اور خرابیوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے، بلکہ ان کمزوریوں اور خرابیوں کو خوبی اور کمال قرار دے لیتے ہیں اور ان لوگوں کو احمق اور بے وقوف بتاتے ہیں جو ان کو خرابی اور برائی کہتے ہیں۔ یہ لوگ جس فلسفہ پر کاربند ہوتے ہیں وہ فلسفہ سرے سے کسی چیز کے لیے کوئی اخلاقی بنیاد تسلیم ہی نہیں کرتا۔ ان کے نزدیک ساری دنیا یا تو بخت و اتفاق کا ایک کرشمہ ہے یا مجرد طاقت کے محور پر گھوم رہی ہے، اس وجہ سے وہ ساری موعظت اور ان کو لاطائل اور بے معنی معلوم ہوتی ہے جو ایک داعی حق ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان کے بام بلند تک اوّل تو غریب داعی کی آواز پہنچ ہی نہیں پاتی اور اگر پہنچتی بھی ہے تو وہ اس کو ایک صدائے بے ہنگام قرار دے کر سنی اَن سنی کر دیتے ہیں اور بدستور اپنی دلچسپیوں میں منہمک رہتے ہیں۔ انہیں نہ تو اپنے فکر میں کوئی خرابی نظر آتی ہے، نہ اپنے نظام میں کسی خلا کا احساس ہوتا۔ بڑی چیخ پکار کے بعد، اگر ان میں سے کوئی اپنے خوابِ

خرگوش سے بیدار ہوتا بھی ہے اور اس کو داعی کی کوئی بات اپیل کرتی بھی ہے تو کبر و خود پرستی کا نشہ اس کو سچائی کے اقرار سے روک دیتا ہے، یا پھر مفاد پرستی اور خود غرضی کی مصلحت غالب آ کر اس کو سلا دیتی ہے۔ البتہ اس چیخ و پکار سے وہ لوگ ضرور متاثر ہو جاتے ہیں جو سلیم الفطرت ہوتے ہیں اور وقت کے نظام باطل سے یا تو بیزار ہوتے ہیں، یا کم از کم اس کے ساتھ کوئی مفاد پرستانہ وابستگی نہیں رکھتے۔ یہ لوگ اس دعوت کو قبول کرنے کے لیے بڑھتے ہیں۔ یہ زیادہ تر غریب لوگ ہوتے ہیں، جو نہ سیادت و قیادت کے پندار میں مبتلا ہوتے ہیں، نہ ان کے سامنے اغراض و مفاد کی حفاظت کا سوال ہوتا، اور نہ ان کے اندر اپنے وقت کے نظام کی حمایت ہی کے لیے کوئی بے جا عصبیت ہوتی، یہ ان اسباب و وسائل سے ایک بڑی حد تک محروم ہوتے ہیں جو فتنے میں ڈالنے والے ہوتے ہیں، اس وجہ سے ان کے دل مردہ نہیں ہوئے ہوتے ہیں، بلکہ کچھ رمق باقی ہوتی ہے اور تھوڑی سی تحریک سے ان کے اندر زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اس گروہ میں سے اوّل اوّل حق کی طرف وہ لوگ سبقت کرتے ہیں جو جواں عمر اور جواں ہمت ہوتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن میں تصریح ہے کہ ان کی دعوت پر سب سے پہلے ان کی قوم کے کچھ نوجوان ایمان لائے۔ کم و بیش یہی صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں بھی پیش آئی۔ آپ کی بعثت کے ابتدائی دور میں جو لوگ ایمان لائے ان میں زیادہ تر نوجوان ہی تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نوجوانوں کے خون میں حرارت اور ان کے اخلاق میں قوت ہوتی ہے۔ ان کی حمیت و غیرت کچھ تو طبعاً بیدار ہوتی ہے، کچھ آسانی سے بیدار کی جاسکتی ہے۔ یہ مخالفتوں سے بہت کم مرعوب ہوتے ہیں اور مصلحتوں کو بہت کم خاطر میں لاتے ہیں۔ یہ جب کسی بات کا حق ہونا محسوس کر لیتے ہیں تو انہیں اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ اس کے قبول کر لینے کے بعد انہیں کن جانی و مالی مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ وہ ان ساری باتوں سے بالکل بے پروا ہو کر اس کو قبول کرتے ہیں اور مصائب کی تلخی ان کے جوش کو سرد کرنے کی بجائے اور زیادہ تیز کرتی ہے۔

دعوت کے اس ابتدائی دور میں اہل حق کو جو آزمائشیں پیش آتی ہیں وہ وقت کے اربابِ اقتدار کی پیدا کردہ نہیں ہوتیں۔ اربابِ اقتدار تو، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، شروع شروع میں دعوت اور داعی کا سرے سے کوئی نوٹس ہی نہیں لیتے۔ اس ابتدائی دور میں ساری مشکلیں اور مزاحمتیں آدمی کے اپنے قریبی ماحول سے سر اٹھاتی ہیں۔ اس دور میں باپ اور بیٹے، ماں اور بیٹی، بھائی اور بھائی، چچا اور بھتیجے، ماموں اور بھانجے، بیوی اور شوہر، خادم اور آقا، مالک اور غلام، استاد اور شاگرد کی جنگ برپا ہوتی ہے۔ باپ بیٹوں کو قبول حق سے روکنے کے لیے ساری نرم و گرم تدبیریں استعمال کرتے ہیں، ان کو اپنے حقوق اور اپنی دیرینہ توقعات یاد دلاتے ہیں، اپنی مالی مشکلات اور بڑھاپے کا حوالہ دیتے ہیں۔ خود ان کی اپنی ذمہ داریاں اور فرائض سامنے لاتے ہیں۔ اس راہ کے خطرات و مصائب ایک ایک کر کے گناتے ہیں، خاندان کی تباہی کا رونا روتے ہیں، امیدوں کی بربادی کا ماتم کرتے ہیں اور سب سے آخر میں گھر سے نکال دینے، اور جائیداد سے محروم کر دینے کی دھمکی دیتے ہیں اور بس چلتا ہے تو ایذا رسانی اور زدوکوب پر اتر آتے ہیں۔ یہ سب کچھ کس لیے؟ اس لیے کہ بیٹے نے اگر کسی حق کے قبول کرنے کا ارادہ کیا ہے تو اس سے باز آ جائے اور اگر قبول کر لیا ہے تو اس سے برگشتہ ہو جائے! اسی سے ملتا جلتا رویہ ماں کا بیٹی کے ساتھ، بھائی کا بھائی کے ساتھ، چچا کا بھتیجے کے ساتھ، ماموں کا بھانجے کے ساتھ، بیوی کا شوہر کے ساتھ، آقا کا خادم کے ساتھ، مالک کا غلام کے ساتھ اور استاد کا شاگردوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جو جس نوعیت سے جس کے اوپر اقتدار رکھتا ہے اس اقتدار کو حق سے پھیرنے کے لیے استعمال کرتا ہے اور جس کے جس طرح کے بھی نسبی، شرعی اور اخلاقی حقوق کسی پر ہوتے ہیں، ان کی قیمت وہ صرف یہ مانگتا ہے کہ ان کے معاوضہ میں وہ اس کے اختیار کیے ہوئے باطل کو پوجتا رہے اور اس کے حقوق کے احترام میں سب سے بڑے حق والے ـــــــ خدا ـــــــ سے بغاوت کرے۔

اس دور کی مشکلات کا بیان، قرآن مجید میں سورۂ عنکبوت میں ہوا ہے اور ساتھ ہی ان

کے حل کے لیے جو اصولی ہدایات درکار ہیں وہ بھی بیان کر دی گئی ہیں۔ ہمارے لیے زیادہ تفصیل میں جانے کا موقعہ نہیں ہے، اس لیے صرف ضروری اشارات پر قناعت کریں گے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی اصولی بات یہ بیان فرمائی گی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جھوٹوں اور سچوں میں امتیاز کرنے کے لیے یہ قانون ٹھہرایا ہے کہ اہل حق مختلف قسم کی مشکلوں میں ڈال کر آزمائے جاتے ہیں کہ وہ اپنے دعوائے حق میں جھوٹے ہیں یا سچے ہیں۔ اس وجہ سے انہیں آزمائشوں سے آزردہ اور بددل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ خندہ جبینی اور استقلال کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا چاہیے اور اس بات پر اطمینان رکھنا چاہیے کہ اس آزمائش کے کورس سے گزرنے کے بعد کامیابی انہیں کو حاصل ہوگی:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۝ وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ لَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ۝ (العنکبوت ۲۹: ۲-۳)

''کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ محض یہ کہہ دینے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے؟ اور ہم نے تو ان لوگوں کو بھی آزمایا جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ سو اللہ ان لوگوں کو ممیز کرے گا جو سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی ممیز کر کے رہے گا۔''

اس کے بعد اس مزاحمت کے بارہ میں اصولی ہدایت دی جو والدین کی طرف سے اہل حق کو پیش آتی ہے اور یہی ہدایت ان تمام حالات پر منطبق ہوگی جہاں قبول حق میں مزاحمت کرنے والے یا اس سے پھیرنے والے والدین کی سی منزلت میں ہوں۔ فرمایا:

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ؕ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ (العنکبوت ۲۹: ۸)

''اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی۔ اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا، جس کے بارے میں تجھے کوئی علم نہیں، تو ان کی

بات نہ مان۔"

یعنی خدا کے حقوق چونکہ والدین کے حقوق سے بڑے ہیں، اس وجہ سے جہاں تک خدا کی اطاعت کا تعلق ہے اس میں والدین کی کسی مزاحمت کی پروا کرنا جائز نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں والدین اور بزرگوں کی اس جذباتی اپیل کا جواب بھی دے دیا ہے جو وہ بالعموم نوجوانوں سے کیا کرتے ہیں کہ تم ہمارے مشورے پر چلتے رہو، اگر تم اس کو باطل سمجھتے ہو تو عذاب وثواب ہم بھگت لیں گے۔ تم پر عذاب وثواب کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَ مَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَ لَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۫ وَ لَيُسْئَلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳﴾ (العنکبوت ۲۹: ۱۲-۱۳)

"اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہماری راہ پر چلتے رہو، ہم تمہارے گناہوں کا بوجھ اٹھالیں گے۔ حالانکہ وہ ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی اٹھانے والے نہیں بنیں گے۔ وہ بالکل جھوٹے ہیں اور یہ لوگ اپنے گناہ لادے ہوئے ہوں گے اور اپنے گناہوں کے ساتھ کچھ اور بوجھ بھی۔ اور جو افتراء وہ کررہے ہیں قیامت کے دن اس کی بابت ان سے پرسش ہونی ہے۔"

ان اصولی ہدایت کے بعد تین اولوالعزم انبیاء حضرت نوح، حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہم السلام کی مثالیں پیش کی ہیں جن کے عملی نمونے اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ ایک بندۂ حق کو اپنے قریب ترین اور محبوب ترین رشتہ داروں کی مزاحمت کے مقابلہ میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے، اور حق کی خاطر رشتہ کی محبت وعصبیت سے کس طرح بے نیاز ہو جانا چاہیے۔ سب سے زیادہ محبوب اور عزیز ترین رشتے تین ہیں: بیٹے کا رشتہ، والدین کا رشتہ، بیوی کا رشتہ۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اسی حق کی محبت میں بیٹے جیسی محبوب چیز کے لیے اپنا کلیجہ پتھر کا بنالیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی حق کے لیے باپ جیسی شفیق اور محترم

ہستی سے علیحدگی کا اعلان کیا۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اسی حق کی خاطر بیوی جیسی محبوب چیز کو چھوڑا۔ بقیہ سارے رشتے ان تینوں رشتوں کے تابع اور احترام ومحبت میں ان سے فروتر ہیں تو جب حق کی خاطر ان کو کاٹ دینے کا حکم ہوا اور بندگانِ حق نے اس سے دریغ نہیں کیا تو دوسرے رشتوں اور ناتوں کا کیا ذکر!

ان مثالوں کو پیش کرنے کے بعد یہ بات بھی واضح کر دی کہ اگرچہ خون اور رحم کے ان رشتوں کو کاٹ دینا اپنے بھرے گھر کو اپنے ہاتھوں اجاڑ دینا ہے، لیکن جو لوگ حق کی محبت میں یہ بازی کھیلنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں اور جی کڑا کر کے کھیل جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے اجڑے گھر کو پھر بساتا ہے اور جو کچھ وہ کھوتے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ تو اس دنیا میں پاتے ہیں، باقی رہی آخرت کی نعمتیں اور برکتیں تو وہ مزید برآں ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہاجرت کا ذکر کرتے ہوئے اس کی برکتوں کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے:

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَ جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ وَ اٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٢٧﴾

(العنکبوت ۲۹: ۲۷)

''اور ہم نے اس کو عطا کیے اسحاق اور یعقوب اور اس کی ذریت میں نبوت اور کتاب کا سلسلہ جاری کیا۔ اور ہم نے اس کا صلہ اس کو دنیا میں بھی دیا اور وہ آخرت میں بھی نیکوکاروں کے زمرے میں سے ہوگا۔''

سب سے بڑی چیز جو آدمی کو اس کے قریبی ماحول سے لڑنے میں بزدل بناتی ہے، وہ اس کی معاشی مشکل ہے۔ حق کی خاطر محبت کے رابطوں کو کاٹ دینا بھی بڑے دل وجگر کا کام ہے، لیکن اگر آدمی ہمت کر کے اس گھاٹی کو پار بھی کر لے تو اس کے بعد اس کو اپنے اس ماحول سے دامن جھاڑ کر اٹھ جانا کچھ آسان نہیں معلوم ہوتا جس کے معاشی وسائل ہی پر اب تک وہ پلا اور بڑھا ہے اور جس کے دائرہ سے باہر کی ساری دنیا اس کے لیے بالکل اجنبی

اور بے گانہ ہے۔ اس وسوسہ کو دور کرنے کے لیے قرآن نے اس سورہ میں یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ کی بندگی کا حق بہر حال ادا ہونا چاہیے، اگر چہ اس کے لیے آدمی کو گھر در، سب کچھ چھوڑ نا پڑے۔ جو لوگ خدا کی بندگی اور اطاعت کے عشق میں بے خانماں ہوں گے، خدا کی وسیع زمین ان کے لیے تنگ دامن ثابت نہ ہوگی۔ اگر اس راہ میں ان کو موت آ گئی ——— اور موت سب کو آنی ہے ——— تو ان کے لیے خدا کی بہشت کی جاودانی نعمتیں اور برکتیں ہیں، اور اگر وہ زندہ رہے تو یہ کیوں سوچیں کہ کیا کھائیں گے؟ زمین کا کونسا جاندار ہے جو اپنی روزی اپنے ساتھ باندھے پھرتا ہے؟ لیکن پھر بھی جہاں وہ جاتا ہے خدا اس کو اس کے حصہ کی روزی پہنچاتا ہے! تو انسان تو ان جانوروں کے مقابل میں خدا کی نظر میں بدرجہا زیادہ قیمت رکھتا ہے، آخر وہ اسی کو روزی سے کیوں محروم رکھے گا:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ۫ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿٥٨﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَ كَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۫ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦٠﴾ وَ لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٦١﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ يَقْدِرُ لَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٦٢﴾ (العنکبوت ۲۹:۵۶-۶۲)

"اے میرے بندو، جو ایمان لائے ہو! بے شک میری زمین بڑی کشادہ ہے تو بس میری ہی بندگی کرو۔ ہر جان کو موت کا مزا چکھنا ہے، پھر تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے اور جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے ہم ان کو جنت کے بالا خانوں میں متمکن کریں گے۔ اس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ کیا ہی خوب صلہ

ہے کارگزاروں کا جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر ہر حال میں انہوں نے بھروسہ رکھا۔ اور کتنے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ ہی ان کو بھی رزق دیتا ہے اور تم کو بھی۔ اور وہ سننے والا جاننے والا ہے اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو اور کس نے مسخر کیا ہے سورج اور چاند کو تو وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے۔ تو وہ کہاں اوندھے ہو جاتے ہیں! اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔"

جو لوگ اپنے قریبی ماحول کی جنگ میں مضبوط اور ثابت قدم نکلتے ہیں اور حق کی خاطر اپنے خونی اور رحمی رشتوں کی کوئی پروا نہیں کرتے، وہ قدرتی طور پر ان لوگوں کے اندر اپنے دل کی وابستگی تلاش کرتے ہیں جو اگرچہ خون اور نسب میں ان کے ساتھ اشتراک نہیں رکھتے، لیکن فکر و عمل میں ان کے ہم خیال ہوتے ہیں اور انہی کی طرح حق کی خاطر اپنے ماحول سے کشمکش میں مشغول ہوتے ہیں۔ انسان کی ساخت فطری طور پر ایسی ہے کہ وہ تنہا نہیں زندگی بسر کر سکتا۔ اس وجہ سے وہ جب اپنے پچھلے تعلقات کی بساط لپیٹتا ہے تو لازماً نئے تعلقات کو استوار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اس کی ایک فطری ضرورت ہے جس کے بغیر اس کی زندگی کا صحیح ارتقاء محال ہے۔ اس وجہ سے اہل حق کی جنگ اپنے قریبی ماحول سے جتنی ہی سخت ہوتی جاتی ہے ان کے آپس کے رابطے اتنے ہی مضبوط و محکم ہونا شروع ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ وقت کی سوسائٹی کے اندر یہ ایک مستقل کنبے اور گھرانے کی حیثیت سے ممیّز ہونا شروع ہوتے ہیں اور آہستہ آہستہ اس قدر نمایاں ہو جاتے ہیں کہ ان کا وجود بحیثیت ایک جمعیت کے محسوس ہونے لگتا ہے اور وقت کا نظام ان کے اثر سے متاثر ہونا شروع ہوتا ہے۔

جب داعیان حق اس دور میں پہنچتے ہیں تب وقت کے اربابِ اقتدار چوکنے ہوتے ہیں اور انہیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ جس چیز کو وہ اب تک صرف چند سر پھرے انسانوں کا وسوسہ اور جنون خیال کرتے رہے ہیں، وہ ایک سنجیدہ حقیقت ہے۔ اگر انہوں نے اس کی جلد خبر نہ لی تو اس نظام کی خیر نہیں ہے جس کے وہ علمبردار ہیں اور جس کے دم سے ان کی

تمام عزت و عظمت قائم ہے۔ اس خطرہ کو محسوس کر کے وہ دعوت کو دبانے کے لیے کمر باندھتے ہیں اور اندھا دھند ظلم شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ظلم چونکہ اربابِ اقتدار کا ظلم ہوتا ہے، اس وجہ سے اس میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو انسان انسان کو ستانے کے لیے کر سکتا ہے۔ دنیا کی پچھلی تاریخ میں اہل حق اپنے وقت کے اربابِ اقتدار کے ہاتھوں آگ میں بھونے گئے، تلواروں سے قیمہ کیے گئے، آروں سے چیرے گئے، درندوں سے نچوائے گئے، تپتی ہوئی ریت پر لٹائے گئے، قید خانوں میں بند کیے گئے، اپنے وطنوں سے نکالے گئے۔ اب اگرچہ دنیا فکر و خیال کی آزادی کو بطور اصول کے تسلیم کرنے لگی ہے، لیکن جہاں تک اس دعوت کا تعلق ہے جو زندگی کے سارے شعبوں کو شیطان کی ماتحتی سے نکال کر خدا کی اطاعت کے نیچے لانا چاہتی ہے، اس کے علمبرداروں کے لیے آج بھی دنیا کی تاریخ شاید بدلی نہیں ہے، ان کو ان تمام حالات سے گزرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے جن سے اہل حق کو اس سے پہلے گزرنا پڑتا ہے:

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَ لَمَّا یَاۡتِکُمۡ مَّثَلُ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ ؕ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَ زُلۡزِلُوۡا حَتّٰی یَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِیۡبٌ ﴿۲۱۴﴾

(البقرۃ ۲:۲۱۴)

’’کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تمہیں ان حالات سے سابقہ پیش نہیں آیا جن سے تمہارے اگلوں کو پیش آیا۔ ان کو آفتیں اور مصیبتیں پہنچیں اور وہ اس قدر جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے پکار اٹھتے ہیں کہ اللہ کی مدد کب نمودار ہوگی! بشارت ہو کہ اللہ کی مدد قریب ہے۔‘‘

یہ دور اہل حق کے لیے اگرچہ نہایت سخت ہوتا ہے، لیکن اس میں اگر وہ پامردی دکھا جاتے ہیں اور وقت کے اربابِ کار کے سارے مظالم کے باوجود اپنی دعوت اور اپنے مسلک پر ڈٹے رہ جاتے ہیں تو ان کی اخلاقی قوت کی دھاک ان کے مخالفوں کے دلوں پر

بھی بیٹھ جاتی ہے اور ان کی جماعت اور ان کے مسلک کے لیے وقت کے فکر اور نظام میں اتنی گنجائش نکل آتی ہے کہ جو لوگ کبھی اس دعوت کا ذکر سننا بھی گوارا نہیں کرتے تھے وہ اس بات کے لیے تگ ودو شروع کر دیتے ہیں کہ کسی طرح کوئی بیچ کی راہ ایسی نکل آئے جس پر دونوں فریق راضی ہو سکیں اور یہ جھگڑا کسی طرح ختم ہو۔ لیکن اصول کے معاملہ میں سمجھوتے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اس وجہ سے اہل حق مجبور ہوتے ہیں کہ جس طرح انہوں نے اربابِ اقتدار کے بے تحاشا ظلم کا مقابلہ کیا ہے، اسی طرح ان کی اس خواہش باطل کا بھی مقابلہ کریں، اور ان پر ثابت کر دیں کہ جس مسلک کے وہ داعی ہیں اس سے انچ برابر بھی وہ ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہی دور ہے جس میں اہل حق کی رہنمائی کے لیے یہ آیتیں اتری ہیں:

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ (یونس ۱۰:۱۵)

"اور جب ہماری کھلی ہوئی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہماری ملاقات کے متوقع نہیں ہیں، کہتے ہیں: اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں ترمیم کرو۔ کہہ دو: مجھے کیا حق ہے کہ میں اس میں اپنے جی سے ترمیم کر دوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے۔ اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔"

اہل باطل کی اسی خواہش کی جڑ کاٹ دینے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے مسلک حق کی از سر نو وضاحت کرا دی گئی تا کہ سمجھوتہ کی توقع کا ایک قلم خاتمہ ہو جائے:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۖۚ وَ

اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٤﴾ وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ
حَنِيْفًا ۚ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٥﴾ (یونس ۱۰: ۱۰۴-۱۰۵)

''کہہ دو: اے لوگو! اگر تم میرے دین کے باب میں شک میں ہو تو سن لو کہ میں ان کو نہیں پوجتا جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، بلکہ میں اس اللہ کو پوجتا ہوں جو تم کو وفات دیتا ہے اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں ایمان والوں میں سے بنوں اور یہ کہ اپنا رخ، یکسو ہو کر، اطاعت کی طرف کرو اور مشرکوں میں سے نہ بنو۔''

اس طرح کی سمجھوتے کی دعوتیں بسا اوقات اہل حق میں سے بھی بعض لوگوں کو متاثر کر دیتی ہیں اور وہ بھی کسی غلط فہمی کی وجہ سے مصلحت اسی میں سمجھنے لگتے ہیں کہ نرم گرم کچھ سمجھوتہ ہو جائے۔ ان لوگوں کی اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے یہ موعظت اتری:

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ وَ لَا تَطْغَوْا ۚ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿١١٢﴾ وَ لَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿١١٣﴾ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۚ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿١١٤﴾ وَ اصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١١٥﴾ (هود ۱۱: ۱۱۲-۱۱۵)

''تو تم جمے رہو، جیسا کہ تمہیں حکم ملا ہے اور وہ بھی جنھوں نے تمہارے ساتھ توبہ کی ہے اور کج نہ ہونا، بے شک وہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور ان لوگوں کی طرف مائل نہ ہوجیو جنھوں نے ظلم کیا کہ تمہیں بھی دوزخ کی آگ پکڑے اور تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی حامی نہیں، پھر تمہاری مدد نہیں کی جائے گی۔ اور نماز کا اہتمام کرو، دن کے دونوں حصوں میں اور شب کے کچھ حصہ میں۔ بے شک نیکیاں دور کرتی ہیں بدیوں کو۔ یہ یاددہانی ہے یاددہانی حاصل کرنے والوں کے لیے اور ثابت قدم رہو، اللہ خوب کاروں کا اجر ضائع نہیں کرے گا۔''

جب اہل حق اس دور سے بھی کامیابی سے گزر جاتے ہیں اور مخالفین کے خوف اور ان

کی دعوت، صالحت سے متاثر ہو کر دعوت میں کسی کمی بیشی اور ترمیم وتغیر پر راضی نہیں ہوتے، بلکہ اپنی پوری دعوت کو بغیر کسی ترمیم کے پوری بے خوفی کے ساتھ جاری رکھتے ہیں تو اربابِ اقتداران کو شکست دینے کے لیے ایک نئی چال چلتے ہیں۔ اب وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح دعوت کے لیڈروں کو طمع کے دام میں شکار کریں۔ اس کے لیے وہ داعیوں کے سامنے وہ سب چیزیں پوری فراخ دلی کے ساتھ پیش کرتے ہیں جو اس دنیا میں چاہی جاسکتی ہیں: زیادہ سے زیادہ دولت، بڑے سے بڑا منصب، وقت کے منافع میں پوری حصہ داری۔ اور اس کا معاوضہ وہ صرف یہ مانگتے ہیں کہ داعی کسی طرح اس دعوت میں کچھ ترمیم کرنے پر راضی ہو جائے جس نے ان کا چین اور اطمینان غارت کر رکھا ہے۔ یہ خوبصورت بلا پچھلی تمام خوفناک بلاؤں سے بھی، اہل حق کے لیے زیادہ سخت ہوتی ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو فتنہ خلق قرآن کے سلسلہ میں خلیفہ وقت کی طرف سے جب بے تحاشہ کوڑے مارے گئے تو انہوں نے ان کوڑوں کی ذرا بھی پروانہ کی۔ جن کوڑوں کا ذکر کتابوں میں اس طرح آتا ہے کہ اگر اتنے کوڑے کسی ہاتھی کے بھی مارے جاتے تو وہ بھی چیخ اٹھتا، کوڑوں کی بارش پر امام کی زبان سے اف بھی نہ نکلا۔ لیکن جب اس کے بعد خلیفہ وقت نے امام کی عزیمت سے شکست کھا کر پینترا بدلا، اور کوڑوں کی جگہ ان پر انعام واکرام کی بارش شروع کی تو وہ چیخ اٹھے کہ "خدا کی قسم! یہ انعام واکرام مجھ پر کوڑوں سے بھی سخت ہے"۔ دعوت حق کے لیے یہ دور بڑی ہی آزمائش کا دور ہوتا ہے۔ کراہیت موت کے فتنہ سے حب دنیا کا فتنہ بدر جہا زیادہ سخت وشدید ہے۔ بڑے بڑے اربابِ عزیمت جو لوہے کی زنجیروں کو اپنی ایک ہی جنبش میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں، چاندی اور سونے کی زنجیروں کو خود شوق سے زیور کی طرح پہن لیتے ہیں اور پھر کبھی ان سے آزاد ہونے کا دل میں خیال بھی نہیں لاتے۔ خوف کا بھوت جن لوگوں کو مرعوب کرنے سے عاجز رہتا ہے، ان کا طمع کا شیطان اس آسانی سے پچھاڑ لیتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہ پہلے ہی سے ہمت ہارے بیٹھے تھے۔ اس دور کی آزمائشوں کے لیے دعوت حق کی تاریخ میں بہترین اُسوۂ خود نبی کریم صلی

اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے۔ قریش نے سخت سے سخت مصیبتوں میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ڈال کر جب دیکھ لیا کہ یہ اپنی دعوت سے نہ باز آنے والے ہیں اور نہ اس میں کسی ادنیٰ ترمیم پر راضی ہیں تو آپ کے پاس جا کر درخواست کی کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ کیا مال و دولت؟ اگر اس چیز کی خواہش ہے تو اس کی زیادہ سے زیادہ مقدار پیش کرنے کو ہم تیار ہیں۔ کسی معزز گھرانے میں شادی؟ اگر اس کا ارمان ہے تو ہم میں سے ہر ایک اس بات کے لیے بھی تیار ہے کہ آپ کی یہ خواہش بھی پوری کی جائے گی۔ کیا قوم کی افسری اور سرداری؟ اگر آپ اس کا شوق رکھتے ہیں تو ہم یہ جگہ بھی آپ کے لیے خالی کیے دیتے ہیں۔ لیکن خدارا، آپ اپنی اس دعوت کو بند کیجیے اور باپ دادا کے دین کو بدلنے کی کوشش نہ کیجیے! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ان ساری ترغیبات کے جواب میں ایک حرف بھی نہیں فرمایا، بلکہ قرآن شریف کی چند آیتیں ان کو پڑھ کو سنائیں جن میں انہی مقاصد کا نہایت موثر الفاظ میں اعادہ تھا جن کی دعوت کے لیے آپ قریش کے ہاتھوں یہ سب کچھ جھیل رہے تھے۔ قریش آپ کا یہ جواب سن کر آپ سے مایوس ہو گئے۔

اس منزل سے بھی داعیانِ حق بخیریت گزر جاتے ہیں تو ایک طرف تو دعوت حق، تبلیغ اور اتمام حجت کی آخری حد کو پہنچ جاتی ہے، یہاں تک کہ جن کے اندر کچھ بھی اخلاقی رمق باقی ہوتی ہے وہ یا تو اعلانیہ حق کا اظہار کر کے اہل حق کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں، یا کم از کم دل سے اس حق کا اقرار کر لیتے ہیں اور اس کے اظہار کے لیے کسی سازگار ساعت کا انتظار کرتے ہیں۔ دوسری طرف دعوت حق کے مخالفین، دعوت کو دبانے کی تمام کوششوں سے مایوس ہو کر اس کو یک قلم ختم کر دینے کا آخری فیصلہ کر لیتے ہیں اور تمام نتائج سے بے پروا ہو کر داعی اور دعوت سب کو کچل ڈالنا چاہتے ہیں۔ یہی وہ موقعہ ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا فیصلہ کیا گیا، حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی پر چڑھانے کی کوشش کی گئی، اور آنحضرت صلی اللہ عایہ وسلم کے متعلق قریش کے تمام اربابِ حل وعقد نے دارالندوہ میں جمع ہو کر مختلف قسم کی تجویزیں پیش کیں۔ کسی نے کہا: آپ کو

پابہ زنجیر کر کے کسی مکان میں بند کر دیا جائے، کسی نے رائے دی کہ آپ کو ملک سے نکال دیا جائے، بالآخر ابوجہل کی اس تجویز پر سب کا اتفاق ہوا کہ قریش کے ہر خاندان کا ایک ایک آدمی آمادہ ہو اور سب مل کر ایک ساتھ آپ پر تلوار ماریں تاکہ آلِ ہاشم آپ کے قتل کا بدلہ نہ لے سکیں۔

جب معاملہ اس حد کو پہنچ جاتا ہے تو داعیان حق کے لیے اپنی قوم کے اندر اپنی جان کی حفاظت ناممکن ہو جاتی ہے، تب دعوت حق، برأت اور ہجرت کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے۔

دوسرا مرحلہ ——— برأت و ہجرت

دعوت حق کا دوسرا مرحلہ برأت اور ہجرت کا مرحلہ ہے۔ اس کا وقت اس وقت آتا ہے جب داعیان حق اپنے ماحول کو دودھ کی طرح بلو کر اس کا مکھن نکال چکتے ہیں اور وقت کی سوسائٹی اخلاقی صفات کے اعتبار سے صرف چھاچھ کی مانند رہ جاتی ہے۔ جن لوگوں کے اندر ذرا بھی صلاحیت ہوتی ہے، وہ دعوت کے ہمنوا بن چکتے ہیں اور جن کے دل بالکل مردہ ہو چکے ہوتے ہیں، وہ دعوت کی مخالفت میں غصہ و نفرت کی آخری حد کو پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ دعوت کو دبانے یا اس کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی تمام توقعات سے مایوس ہو کر وہ اس بات پر کمر باندھ لیتے ہیں کہ داعی اور دعوت کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں، جب یہ وقت آجاتا ہے اور داعیان حق محسوس کرتے ہیں کہ اس ماحول کے اندر نہ صرف دعوت و تبلیغ کا کام، بلکہ سرے سے سانس لینا ہی ان کے لیے ناممکن ہو گیا ہے، تب وہ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے ماحول سے علیحدگی کا اعلان کریں اور اس کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ منتقل ہو جائیں جہاں ان کو اپنے مسلک کے مطابق زندگی بسر کر سکنے کی توقع یا کم از کم ایمان پر قائم رہ کر جینا ممکن ہو۔ جہاں تک حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا تعلق ہے، اس ہجرت کے وقت اور اس کے مقام، دونوں چیزوں کا تعین ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ وہ براہ

راست رؤیا یا وحی کے ذریعہ سے ان کو عین وقت پر ہدایت فرماتا ہے کہ اب تبلیغ ودعوت کا حق ادا ہو چکا اور تم کو فلاں وقت یہاں سے نکل کر فلاں مقام پر چلے جانا چاہیے۔ انبیائے کرام کی بعثت کا اصلی مقصد تبلیغ رسالت اور اتمام حجت ہے، اس وجہ سے جب تک قوم کے اندر ان کا قیام ضروری ہوتا ہے اس وقت تک اللہ تعالیٰ ان کو قوم کے اندر روکتا ہے تاکہ تبلیغ کا حق پوری طرح ادا ہو جائے اور اتمام حجت میں کسی پہلو سے کوئی کسر نہ رہ جائے۔ جب یہ حق ادا ہو چکتا ہے تو ان کو ہجرت کی اجازت ملتی ہے۔ اس اجازت کے بغیر ان کے لیے قوم کو چھوڑنا جائز نہیں ہے، کیونکہ بعض حالات میں اس کا امکان ہے کہ شدتِ غیرت یا حمیت حق یا کسی اور سبب سے وہ قوم کو چھوڑ کر چلے جائیں اور اتمام حجت اور تبلیغ کا فرض ابھی پورا ادا نہ ہوا ہو۔ حضرت یونس علیہ السلام سے اسی طرح کی فروگزاشت ہوئی کہ وہ حمیت حق کی وجہ سے قوم کو وقت سے پہلے چھوڑ کر چلے گئے، جس کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے ان پر عتاب فرمایا اور تبلیغ ودعوت کے فرض کو پورا کرنے کے لیے ان کو دوبارہ قوم میں واپس بھیجا اور اس دوبارہ دعوت سے ان کی قوم کا بڑا حصہ مشرف بہ اسلام ہوا۔

انبیاء علیہم السلام کے ماسوا دوسرے داعیان حق کو اس ہجرت کے وقت کا تعین اپنے اجتہاد سے کرنا پڑتا ہے اور چند باتیں اس اجتہاد میں ان کو بحیثیت اصول کے پیش نظر رکھنی پڑتی ہیں۔

ایک یہ کہ ہجرت ہر دعوت حق کے لیے کوئی لازمی شرط نہیں ہے، بلکہ یہ ضرورت اور حالات کے تابع ہے۔ داعیان حق کا اصلی کام یہ ہے کہ وہ دعوت وتبلیغ کے ذریعہ سے لوگوں کو نظامِ حق کا معتقد بنائیں اور جب وہ اس کے معتقد ہو جائیں تو ان کی اجتماعی طاقت سے اس نظامِ حق کو عملاً جاری ونافذ کریں۔ پس جب تک ان کو کسی سرزمین پر اس چیز کا موقع حاصل ہے کہ وہاں کے لوگوں کو پورے دین کی، بغیر کسی مجبور کن مزاحمت کے، دعوت دے سکتے ہیں اس وقت تک ان کے لیے وہاں سے ہجرت جائز نہیں ہے اگرچہ اسی کام میں ان کی پوری زندگیاں کھپ جائیں اور اگرچہ ان کو نہ تو ان کی دعوت کے قبول کرنے والے ہی

ملیں اور نہ ان کو اپنے مسلک کے مطابق کوئی نظامِ زندگی قائم کر سکنے کا موقع ہی میسر آئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے پوری زندگی دعوتِ حق میں بسر کر دی، لیکن چونکہ ان کے کام میں بادشاہِ وقت کی عقیدت کی وجہ سے کوئی عملی مزاحمت ایسی نہیں پیش آئی جو ان کی دعوت کے کام کو یک قلم معطل کر دے، اس وجہ سے وہ برابر آخر دم تک اپنے کام میں لگے رہے، اگرچہ مصر میں ان کو اتنے آدمی نہ مل سکے کہ وہ ان کی مدد سے وہاں خالص اسلامی اصولوں پر کوئی نظام قائم کر کے چلا سکتے۔

دوسری یہ کہ معمولی درجہ کی مزاحمت و مخالفت کسی ماحول سے ہجرت کے لیے کافی وجہ نہیں بن سکتی۔ ایک ایسی دعوت جو ہر پہلو سے وقت کے افکار و عقائد اور زمانہ کے اصولِ معاشرت و سیاست سے مختلف ہو، اس سے فی الجملہ عام لوگوں کی بیزاری و بیگانگی تو ایک قدرتی چیز ہے، یہ بیزاری و بیگانگی اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ داعیانِ حق اس سے بددل ہو کر اس ماحول سے بھاگ کھڑے ہوں۔ اس طرح کی مخالفتوں کے علی الرغم حضرات انبیائے کرام نے ہمیشہ اپنے کام کو بغیر کسی مایوسی اور بددلی کے جاری رکھا ہے۔ ان مخالفتوں کے مقابل میں صبر و استقامت، مخالفین پر اتمام حجت کے لیے بھی ضروری ہے اور خود داعیانِ حق کی عزیمت کے امتحان کے لیے بھی ناگزیر ہے۔ اس چیز کی جانچ کیے بغیر اللہ تعالیٰ کے یہاں نہ تو اہل حق کو ان کی حق پرستی کا صلہ ملتا، نہ اہل باطل کو باطل پرستی پر کوئی عذاب آتا۔ اہل حق کے لیے اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا ایک کورس ہے جس سے بہر صورت ان کو گزرنا پڑتا ہے اور اس سے گزر چکنے کے بعد ہی ان کو کامیابی کا تمغہ ملتا ہے۔ البتہ جب قوم کی مخالفت بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ اہل حق کا وجود اپنے اندر سرے سے برداشت ہی نہیں کر سکتی اور متفقہ طور پر ان کے استیصال کا فیصلہ کر لیتی ہے، اس وقت داعیان حق کے لیے یہ بات جائز ہو جاتی ہے کہ وہ ان کے کفر کا فیصلہ کر کے ان سے علیحدگی کا اعلان کر دیں اور وہاں سے ہجرت کر جائیں۔ قرآن مجید میں جتنے انبیاء کی ہجرت کا بیان ہوا ہے، ہر ایک کی سرگزشت سے یہ حقیقت واضح ہے کہ انہوں نے برأت و ہجرت کا اعلان

اسی وقت کیا ہے جب ان کی قوموں نے ان کو سنگ سار کر دینے، یا قتل کر دینے، یا ملک سے نکال دینے کا آخری فیصلہ کر لیا ہے۔ مخالفین کی طرف سے اس طرح کے اقدام کے بغیر کسی نبی نے بھی ہجرت نہیں فرمائی۔

تیسری چیز یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام اور داعیان حق کی ہجرت اس فرار سے بالکل مختلف ہے جو ایک قوم دوسری قوم کی زیادتیوں اور چیرہ دستیوں سے ڈر کر اختیار کرتی ہے۔ یہ فرار ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف ہوتا ہے اور داعیان حق کی ہجرت باطل سے حق کی طرف ہوتی ہے۔ اس وجہ سے داعیانِ حق کے لیے ہجرت سے پہلے دو باتوں کا جائزہ لے لینا ضروری ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ جن لوگوں کے اندر سے وہ ہجرت کر رہے ہیں قبولِ حق کے پہلو سے ان کا کیا حال ہے۔ دوسرا یہ کہ جن لوگوں کی طرف ہجرت کر رہے ہیں حق پرستی کے اعتبار سے ان کا کیا درجہ ہے۔ اس جائزہ کے لیے انہیں پہلے اپنے ماحول کی صلاحیتوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا پڑتا ہے کہ حق کی تخم ریزی کے لیے اس زمین میں کوئی صلاحیت باقی ہے یا نہیں۔ اگر وہ اس کے اندر کوئی صلاحیت پاتے ہیں تو اپنی مخلصانہ کوششوں کا سب سے زیادہ حقدار وہ اسی ماحول کو سمجھتے ہیں اور اپنا سارا زور اسی کی اصلاح و تربیت پر صرف کرتے ہیں۔ ہاں اگر پوری طرح امتحان کرنے کے بعد اس پہلو سے اس کا ناکارہ اور بے مصرف ہونا ان پر ثابت ہو جاتا ہے تو باہر کی طرف نظر دوڑاتے ہیں کہ زمین کا کون سا ٹکڑا اس مقصد کے لیے زیادہ موزوں ہو سکتا ہے، اور جس ٹکڑے پر ان کی نظر انتخاب جمتی ہے وہاں جا کر ڈیرے ڈالتے ہیں اور قسمت آزمائی کرتے ہیں۔

انبیاء کے علاوہ عام داعیانِ حق جس طرح ہجرت کے وقت کا فیصلہ اپنے اجتہاد سے کرتے ہیں اسی طرح انہیں ہجرت کے مقام کا انتخاب بھی اپنے اجتہاد ہی سے کرنا پڑتا ہے، اس انتخاب میں جو چیز بطور اصل الاصول کے انہیں پیش نظر رکھنی پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ ہجرت کا مقام، دعوت اور مقاصد دعوت کے لحاظ سے سازگار ہو، خواہ دوسرے اعتبارات سے اس کی کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو۔ یہ دارالہجرت ایک چٹیل بیابان بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ریگستانِ حجاز کی طرف ہجرت فرمائی۔ دودھ اور شہد کی ایک زرخیز سرزمین بھی ہوسکتی ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو ملک شام میں لے گئے۔ اس کی تلاش میں کبھی اپنے وطن سے باہر بھی نکلنا پڑتا ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کو نکلنا پڑا اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی ملک کے کسی گوشہ کو دعوتِ حق کے لیے مہربان اور سازگار بنا دیتا ہے جس ملک میں دعوت حق کا ظہور ہوتا ہے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں پیش آیا۔

کسی دعوت کے متعلق آغازِ کار میں یہ فیصلہ نہایت دشوار ہے کہ جس زمین میں اس کا بیج بویا جا رہا ہے اسی زمین میں اس کی فصل بھی تیار ہوگی یا بیج تو کسی اور زمین میں ڈالے جا رہے ہیں، لیکن فصل کسی اور زمین سے کاٹی جائے گی اور وہ زمین کون سی زمین ہوگی؟ ملک سے باہر، یا ملک کے اندر؟ کوئی شور اور بنجر علاقہ، یا کوئی آباد اور معمور خطہ ارضی؟ جو لوگ حق کی تخم ریزی کے لیے اٹھتے ہیں ان کے اپنے اندازے اور تخمینے اس بارہ میں کوئی چیز نہیں ہیں۔ ان کی رہنمائی صرف وہ کرتا ہے جس کی رضا جوئی کے عشق میں چند دانے جھولی میں ڈال کر وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ البتہ اتنی بات قطعی ہے کہ حق کے بیج، اگر ان کے بونے والے اپنے آنسو اور خون سے ان کو سینچنے کے لیے تیار ہوں، ضائع نہیں جاتے۔ اگر زمین کا ایک حصہ اس کی پروش سے انکار کر دیتا ہے تو کوئی دوسرا گوشہ اس کی پرورش کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ اگر مشرق میں اس کی کھیتیاں شاداب نہیں ہوتیں تو مغرب میں اس کی فصلیں لہلہا اٹھتی ہیں، اور ایک دن آتا ہے کہ بھرنے والے ان سے کھتے بھر لیتے ہیں اور جمع کرنے والے ڈھیریاں جمع کر لیتے ہیں اور دنیا کی دنیا ان سے سیری اور آسودگی حاصل کرتی ہے۔

اس ہجرت کا مقصد، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، محض مخالفین کی چیرہ دستیوں سے فرار نہیں ہے، بلکہ اس سے دعوتِ حق کے چند اہم مقاصد پورے ہوتے ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

اس کا مقصد اہل حق کے اعتقادی مطالبات اور ذہنی تقاضوں کی عملی تکمیل ہے۔ وہ

جس روز سے لذتِ حق سے آشنا ہوتے ہیں اسی روز سے ارادۃً اور نیتۃً مہاجر ہوتے ہیں۔ وہ اپنے وقت کے عقائد و اعمال سے بیزار ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح ان سے دوری حاصل ہو۔ وہ اپنے زمانہ کی سوسائٹی سے متنفر ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی دلجمعی کے لیے کوئی صالح سوسائٹی ملے۔ وہ اپنے عہد کے نظام کو باطل کا ایک شکنجہ تصور کرتے ہیں اور خواہش مند ہوتے ہیں کہ اس سے کسی طرح نجات حاصل کریں۔ ان کے باطن کی قوت شامہ بیدار ہو چکی ہوتی ہے اور ماحول کے ہر گوشہ سے ان کو بدبو محسوس ہو رہی ہوتی ہے اس وجہ سے ہر آن وہ کسی ایسی فضا کی تلاش میں ہوتے ہیں، جس میں وہ آزادی سے سانس لے سکیں اور اس بدبو سے پناہ پائیں۔ وہ اس ماحول میں جتنے لمحے بھی گزارتے ہیں محض فرضِ تبلیغ کی ادائیگی کے لیے گزاتے ہیں اس وجہ سے اس فرض کے ادا ہو چکنے کے بعد یہ ان کی ایک فطری ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس ماحول سے علیحدہ ہو جائیں اور جس چیز کو انہوں نے باطن میں چھوڑ دیا ہے اس کو ظاہر میں بھی چھوڑ دیں۔ یہ ہجرت کی اصل حقیقت ہے اور اس حقیقت کے لحاظ سے واقعی ہجرت صرف ان لوگوں کی ہجرت ہے جن کے دل اور جسم، دونوں مہاجر ہوں۔ نہ ان لوگوں کی ہجرت جن کے جسم تو ہجرت کر جائیں، لیکن دل وہیں اٹکے ہوئے رہ جائیں جہاں سے انہوں نے ہجرت کی ہے۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ جن لوگوں کے ضمیر کے اندر زندگی کی کوئی رمق باقی ہے ان کو حرکت میں لانے کے لیے آخری کوشش کی جائے۔ جب سوسائٹی کے بہترین افراد، جن کا بہترین ہونا ان کے دشمنوں کو بھی تسلیم ہوتا ہے، جن کی خیر خواہی اور ہمدردی پر مخالفوں کو بھی اعتماد ہوتا ہے، جن کی سچائی اور وفاداری کی ان کے اعداء بھی گواہی دیتے ہیں، جن کی حق دوستی اور خدا ترسی پر ان کی ہجویں کرنے والے اور ان کا مذاق اڑانے والے بھی دل ہی دل میں رشک کرتے ہیں، اپنی سوسائٹی کو، اس کے دیرینہ روابط و تعلقات کو، اس کے اندر اپنے سارے حقوق اور استحقاق کو، اپنے گھر در کو، اپنی املاک و جائداد کو، یہاں تک کہ اپنے محبوب سے محبوب عزیزوں اور عزیز سے عزیز رشتہ داروں کو چھوڑتے ہیں اور اس طرح چھوڑتے

ہیں کہ ان کے دل میں غصہ کے بجائے ہمدردی اور نفرت کے بجائے دل سوزی اور غم خواری ہوتی ہے اور اللہ کی بندگی کے جذبہ کے سوا اس میں کسی ذاتی کدورت اور رنجش کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی نہیں ہوتا تو یہ منظر ایسا نہیں ہے کہ جس میں ذرا بھی انسانی حس موجود ہو اس سے متاثر ہوئے بغیر رہے۔ اس منظر کو دیکھ کر، سنگ دل اور شقی مخالفوں کے سوا، وہ سارے لوگ حرکت میں آ جاتے ہیں جن کے دل کے کسی گوشہ میں حق کی کوئی قدر موجود ہوتی ہے اور ان میں سے بہتیرے اس منظر سے اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ بالآخر وہ اپنی غلط زندگی پر صبر نہیں کر سکتے اور اللہ کا نام لے کر راہِ حق کے جانبازوں اور مجاہدوں میں خود بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ داعیان حق کی طرف سے اپنی قوم کو گویا آخری بار جھنجھوڑنا ہوتا ہے جس کے بعد، ان لوگوں کے سوا جو موت کی نیند سو رہے ہوتے ہیں، اور سارے لوگ اپنے بستروں سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔[1]

اس کا تیسرا مقصد اہل حق کا تزکیہ ہے۔ داعیانِ حق کے لیے جب تک ہجرت کا مرحلہ پیش نہیں آتا اس وقت تک ان کے مخلص و غیر مخلص میں امتیاز نہیں ہوسکتا۔ بہت سے لوگ نفاق کی آلائشیں لیے ہوئے داعیانِ حق کے گروہ میں شامل ہو جاتے ہیں اور اپنے نفاق کو چھپانے میں پوری طرح کامیاب ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ اپنے دل کے مخفی گوشوں میں اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے اعزہ و اقرباء یا اپنے مال و جائداد کی کچھ دوسری وابستگیاں بھی رکھتے ہیں اور یہ چیزیں اس قدر مخفی ہوتی ہیں کہ اپنے دل کے اس چور کی خود انہیں بھی خبر نہیں ہوتی،

---

[1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جن چیزوں نے اسلام قبول کرنے پر ابھارا، اگرچہ عام طور پر ان میں سب سے زیادہ اہمیت ان کی بہن اور بہنوئی کے قبولِ اسلام کو دی گئی ہے، لیکن تاریخوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو سب سے زیادہ متاثر درحقیقت ہجرت حبشہ نے کیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ بہت سے بہترین اشخاص اسلام کے عشق میں ہر قسم کے دکھ اٹھا رہے ہیں، یہاں تک کہ اس کی خاطر وہ اپنا وطن چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے ہیں اور ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جو خود ان کے مظالم کے شکار ہوئے تھے تو ان کے دل کی حالت بدلنی شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ ان کی بہن کی استقامت حق نے آخری پردہ بھی اٹھا دیا۔ سیرت ابن ہشام میں کئی ایسے واقعے ملتے ہیں جو اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے دل کے بدلنے میں سب سے زیادہ دخل ہجرت حبشہ کے واقعہ کو ہے۔

ان لوگوں کے لیے ہجرت ایک کسوٹی کا کام دیتی ہے، جس کے بعد کھرے اور کھوٹے میں پوری طرح امتیاز ہوتا ہے۔ اللہ کے خالص اور مخلص بندے ایک طرف ہو جاتے ہیں اور جو لوگ حق کے مخالف یا دل میں کوئی چور رکھتے ہیں وہ ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ ہجرت کی راہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے اور اس کو صرف وہی لوگ طے کر سکتے ہیں جو سو فی صد مومن و مخلص ہوں۔ اگر نفاق اور آلائش دنیا کا ادنیٰ شائبہ بھی دل کے اندر چھپا ہوا ہو تو ممکن ہے آدمی دوسری آزمائشوں میں کامیاب ہو جائے، لیکن ہجرت کی جانچ میں ضرور پکڑا جاتا ہے۔

چوتھا مقصد یہ ہے کہ ایک آزاد اور پاک فضا میں اہل حق کی تربیت و تنظیم کی جائے تا کہ وہ باطل کے ہاتھوں سے طاقت چھیننے، ایک صالح تمدن کی بنیاد رکھنے اور دنیا کی قیادت اور امامت کے منصب کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے تیار ہو سکیں۔ کافرانہ ماحول، جس میں کفر با قتدار ہو، اس مقصد کے لیے کسی طرح صالح و سازگار نہیں ہو سکتا۔ دعوتِ حق کی فطرت اس پودے کی ہے جو اگنے کو تو ہر طرح کی زمین میں اگ جاتی ہے لیکن نشو و نما اسی وقت پاتا ہے جب اس کو وہاں سے اکھاڑ کر نصب کسی ایسی زمین میں کیا جائے جس پر کسی اور درخت کا سایہ نہ ہو۔ اسی وقت اس کی فطرت کے سارے تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ اسی صورت میں وہ اپنی طبعی رفتار سے بڑھتا ہے اور برگ و بار لاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن اس کی جڑیں پاتال تک پہنچ جاتی ہیں اور اس کی شاخیں ساری فضا میں پھیل جاتی ہے۔ جب تک یہ بات پوری نہ ہو لے اس وقت تک دعوتِ حق کی قوتیں ٹھٹھری ہوئی اور اس کی اصلی صلاحتیں دبی ہوئی رہتی ہیں۔ اس کے رازوں کا نہ تو اپنوں کو اچھی طرح پتہ ہوتا ہے اور نہ اس کے عجائب اور کرشمے دوسروں ہی پر ظاہر ہوتے۔ کچھ متفرق اصول اپنی جگہ پر کتنے ہی دلکش اور منصفانہ ہوں، لیکن ان کے اصلی جوہر کا پتہ نہیں چل سکتا جب تک وہ ایک نظامِ زندگی کے فریم میں دیکھے اور پرکھے نہ جائیں۔ ایک کافرانہ نظامِ زندگی کے تحت توحید، اطاعت الٰہی وحدتِ بنی آدم، خوفِ آخرت کا وعظ کہا جا سکتا ہے اور یہ وعظ بہت سے

سلیم الفطرت لوگوں کو متاثر بھی کر سکتا ہے، لیکن جب انہی اصولوں کی اساس پر کسی آزاد ماحول میں ایک ہیئت اجتماعی وجود میں آ جاتی ہے اور اس کے سارے شعبے درجہ بدرجہ ابھرنے اور اپنا طبعی وظیفہ پورا کرنے لگتے ہیں تو اپنے بھی اس کی صلاحیتوں اور برکتوں کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور دوسرے بھی اس کی قوتوں اور کارفرمائیوں سے ششدر و حیران ہو جاتے ہیں۔

جو ہجرت ان مقاصد اور ان شرائط کے تحت وجود میں آتی ہے اس سے چند نتائج لازمی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔

اس کا پہلا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہجرت کے بعد دعوتِ حق پوری طاقت وقوت سے پھیلنے اور بڑھنے لگتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلمہ حق کے اندر بڑھنے اور پھیلنے، غالب ہونے اور چھا جانے کی غیر معمولی صلاحیتیں ودیعت ہوتی ہیں۔ انسانوں کی فطرت اور اس کائنات کے مزاج کو اس سے طبعی الفت ہے۔ اور یہ دونوں ہی اس کو پرورش کرنا اور فروغ دینا چاہتے ہیں، لیکن جب تک اس پر باطل کا غلاف پڑا رہتا ہے اس وقت تک یہ اس پودے کے مانند مرجھایا ہوا رہتا ہے جس پر کوئی بیگانہ بیل چڑھی ہو اور اس کے رس کو چوس رہی ہو۔ جب اس بیل کے چنگل سے یہ آزاد ہو جاتا ہے اور صالح زمین اور آزاد فضا اس کو مل جاتی ہے تو اس کی ساری زمین اور اپنے اوپر کی ساری دبی ہوئی قوتیں دفعتہً ابھر آتی ہیں اور آناً فاناً وہ ایک ہونہار درخت کی طرح اپنے اردگرد کی ساری فضا کی قوتوں کو اپنی غذا بنانا شروع کر دیتا ہے اور دیکھتے دیکھتے ایک ایسا تناور درخت بن جاتا ہے کہ اس کے سایہ میں قافلے پناہ لیتے ہیں اور قوموں کی قومیں اس کے پھلوں سے غذا اور آسودگی حاصل کرتی ہیں۔

دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باطل فوراً یا بالتدریج فنا ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ باطل کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں ہے۔ اس کو نہ تو انسانی فطرت ہی سے کوئی لگاؤ ہے، نہ اس نظامِ کائنات ہی سے اس کو کوئی مزاجی مناسبت ہے۔ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے ایک مقصد حق کے ساتھ بنایا ہے اور اس کے سارے نظامِ تکوینی میں ایک روحِ حق کارفرما ہے، اس وجہ سے

کسی مجرد باطل کی، جس کے اندر سے حق کے تمام اجزاء نکال کر الگ کر لیے گئے ہوں، پرورش کرنا اس کے مزاج کے بالکل منافی ہے۔ اس کے اندر اگر کوئی باطل پایا جا سکتا ہے تو اسی صورت میں پایا جا سکتا ہے جب اس کے اندر حق کی بھی کچھ ملاوٹ ہو۔ کیونکہ یہ باطل طفیلی پودوں یا طفیلی کیڑوں (PARASITES) کی طرح اسی حق کے سہارے جیتا ہے۔ اور جب یہ حق کا سہارا اس سے بالکل ہی چھن جائے، جیسا کہ اہل حق کی ہجرت کی صورت میں ہوتا ہے، تو پھر باطل کے لیے زندہ رہنا محال ہو جاتا ہے۔ جس طرح اس جسم کے لیے جس کی روح نکل چکی ہو، سڑ جانا ضروری ہے، اسی طرح اس جماعت کا فنا ہو جانا بھی یقینی ہے جس کے اندر سے اہل حق اعلان برأت کر کے رخصت ہو چکے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے حالات میں ہم پڑھتے ہیں کہ ان کی ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی قوموں کو مہلت نہیں بخشی، بلکہ ان سے دو طرح کا معاملہ کیا گیا ہے۔

اگر ہجرت کرنے والے اہل ایمان تعداد میں بہت تھوڑے ہوئے اور اکثریت اہل باطل ہی کی رہی تو اللہ تعالیٰ نے کوئی ارضی یا سماوی عذاب بھیج کر اہل باطل کو فنا کر دیا اور زمین کی وراثت اہل حق کو سونپ دی۔

اگر ہجرت کرنے والے اہل ایمان کی تعداد معتد بہ اور قابل لحاظ ہوئی تو اس صورت میں اہل ایمان کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ خود اہل باطل سے ٹکر لیں اور ان کو حق کے آگے مغلوب کر دیں۔

ان دونوں صورتوں میں حق کا غلبہ اور باطل کی شکست یقینی ہے۔ جس طرح خدا کا عذاب بے پناہ ہے اور اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اہل حق اور اہل باطل کا تصادم بھی لازماً حق کے غلبہ ہی پر منتہی ہوتا ہے اور ممکن نہیں ہے کہ اس تصادم کے واقع ہو جانے کے بعد باطل زیادہ دونوں تک ٹک سکے۔ حضرات انبیائے کرام اور ان کی قیادت میں کام کرنے والی جماعتیں اپنے عہد کے اہل باطل کے لیے خدائی عدالت ہیں اور وہ پورے انصاف کے ساتھ حق و باطل میں فیصلہ کرتی ہیں، اور باطل کتنا ہی زور آور ہو، لیکن اس کو اس عدالت کے فیصلہ کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔

جہاں تک انبیائے کرام کا تعلق ہے، ان کی ہجرت کے بعد دونوں مذکورہ بالا نتائج لازمی طور پر ظاہر ہوتے ہیں اور عقل و نقل، دونوں اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ یہی نتائج اس وقت بھی نکل سکتے ہیں جب ٹھیک انہی لائنوں پر صالحین کی کوئی جماعت کام کرے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اپنے ماحول پر اتمامِ حجت کا حق جس طرح انبیائے کرام ادا کرتے ہیں اس طرح کا اتمام حجت دوسروں سے ممکن نہیں ہے، اس وجہ سے دوسرے اہل حق کی ہجرت کے بعد اس طرح کا عذاب آنا ضروری نہیں ہے جس طرح کا عذاب ان قوموں پر آیا جن کے اندر حضرات انبیائے کرام نے ہجرت فرمائی ہے۔ تاہم حق و باطل کی کوئی کشمکش ہو اور اس میں اہل حق ان تقاضوں کو پورا کر دیں جو حق کی سربلندی کے لیے ضروری ہیں تو اللہ تعالیٰ ضرور ان کی مدد فرمائے گا اور ان کی جدوجہد بالآخر کامیاب ہو کے رہے گی۔

اس ہجرت کے بعد دعوتِ حق تیسرے مرحلہ، یعنی جہاد اور جنگ کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے۔

تیسرا مرحلہ ——— جنگ

دعوتِ حق کے سلسلہ میں جنگ کی نوبت اس وقت آتی ہے جب تبلیغ اور شہادت علی الناس اور ہجرت کے مرحلے گزر چکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی جنگ کے لیے چند ضروری شرطیں ہیں۔ جب تک یہ شرطیں پوری نہ ہولیں اہل حق کے لیے تلوار اٹھانا اور زمین میں خون ریزی کرنا جائز نہیں ہے۔ اور اگر وہ جلد بازی سے ایسا کر بیٹھیں تو ان کا یہ فعل ایک مفسدانہ فعل ہوگا جس پر اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر و ثواب پانا تو الگ رہا الٹا اندیشہ اس بات کا ہے کہ ان سے مواخذہ ہو جائے اور وہ فساد فی الارض کے مجرم قرار پائیں۔

یہ شرطیں مندرجہ ذیل ہیں:

پہلی شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کے خلاف اعلان جنگ کیا جائے ان پر پہلے پوری طرح حق کی تبلیغ کر دی جائے۔ اس تبلیغ کے بغیر کسی قوم کے خلاف اعلان جنگ ناجائز ہے۔ اس

کلیہ سے صرف وہ جنگ مستثنیٰ ہے جو مدافعت وحفاظت میں ہو۔ دفاعی جنگ، ہر حالت میں لڑی جاسکتی ہے۔ اس کو افراد بھی لڑ سکتے ہیں اور جماعتیں بھی لڑ سکتی ہیں۔ یہ جنگ تبلیغ کی شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے۔ جب بھی کسی کے جان اور مال وعزت پر کوئی حملہ ہو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی حفاظت میں جو قوت بھی اس کے پاس بروقت بہم ہو اس کو استعمال کرے۔ اس راہ میں اگر وہ مارا جائے گا تو اس کو شہادت حاصل ہوگی، اور اگر حملہ آور حریف مارا جائے گا تو اس پر دوہرا گناہ ہوگا۔ ایک اس بات کا کہ اس نے اپنی جان ایک معصیت اور حق تلفی کی راہ میں ہلاک کی، دوسرا اس بات کا کہ اس نے ایک صاحبِ حق کی تلوار خون سے آلودہ کرائی۔ باقی رہی جارحانہ جنگ تو وہ اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک مقدم الذکر شرط تبلیغ پوری نہ ہو لے۔ لیکن اس تبلیغ کی دو صورتیں ہیں اور ان دونوں صورتوں میں جنگ کے احکام کی نوعیت کچھ مختلف ہو جاتی ہے۔

(ا) ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ تبلیغ رسول کے ذریعہ سے ہو۔ رسول تبلیغ اور اتمامِ حجت کا کامل ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے اتمامِ حجت کی تمام شرطیں کمال درجہ پوری ہو جاتی ہیں۔ اس عالم اسباب میں عقل انسانی کو مطمئن کرنے کے لیے جو کچھ ممکن ہے وہ بہتر سے بہتر طریق پر ایک رسول پورا کر دیتا ہے اور اس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ اس کو تمام اسباب و وسائل سے مسلح کر کے بھیجتا ہے وہ قوم کے اندر کا بہترین شخص ہوتا ہے، اعلیٰ ترین حسب و نسب کے ساتھ اٹھتا ہے، وہ نبوت سے پہلے بھی اور نبوت کے بعد بھی پاکیزہ ترین اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے، جھوٹ، بہتان، مکاری، بدمعاملگی، ادعائے برتری اور خواہش تفوق کی آلودگیوں سے اس کا دامن بالکل پاک ہوتا ہے اور اس کی ان خوبیوں کی شہادت جس طرح اس کے دوست دیتے ہیں اسی طرح اس کے دشمنوں کو بھی اس کے ان فضائل سے انکار کی مجال نہیں ہوتی۔ وہ بہترین، عام فہم زبان میں اپنی دعوت پیش کرتا ہے اور اس دعوت کو قوم کے بچہ بچہ تک پہنچا دینے کے لیے اپنے رات دن ایک کر دیتا ہے۔ اس کی تعلیم عقلی استدلال کے اعتبار سے اتنی محکم اور مضبوط ہوتی ہے کہ مخالفوں سے اس کا جواب بن نہیں

آتا، اس کے فیض تعلیم وصحبت سے لوگوں کی زندگیاں یکسر بدل جاتی ہیں۔ ظالم اور مفسد، حق شناس اور عدل پسند ہو جاتے ہیں۔ ڈاکو اور راہزن نیکوکار اور امن پسند بن جاتے ہیں، زانی اور بدمعاش، عفیف اور پاک دامن بن جاتے ہیں، شرابی اور جواری، پاکیزہ اخلاق اور خداترس ہو جاتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے پہلے اس کو خود کر کے دکھاتا ہے اور جس قانون و نظام کا داعی ہوتا ہے اس کا سب سے زیادہ پابند و مطیع وہ خود ہوتا ہے۔ وہ اپنی دعوت کی حقیقت کا اپنے ساتھیوں کی زندگی میں بھی مظاہرہ کراتا ہے۔ وہ لوگوں کے مطالبہ پر معجزے بھی دکھاتا ہے۔ ان تمام وجوہ سے ایک رسول کی تبلیغ اتمامِ حجت کا آخری ذریعہ ہے اور جب کسی قوم پر رسول کے ذریعہ سے اتمامِ حجت ہو چکتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بعد کسی قوم کے منکرین حق کو جینے کی مہلت نہیں دیا کرتا، بلکہ لازمی طور پر دو باتوں میں سے کوئی نہ کوئی بات ہو کے رہتی ہے۔ اگر حق کو قبول کرنے والے تعداد میں تھوڑے ہوتے ہیں اور قوم کا بڑا حصہ منکر و مخالف رہ جاتا ہے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو الگ کر لیتا ہے اور منکرین و مخالفین کو کوئی ارضی وسماوی عذاب بھیج کر فنا کر دیتا ہے۔ حضرت نوح، حضرت صالح، حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہ کی قوموں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ اور اگر منکرین کی طرح مومنین کی تعداد بھی معتدبہ اور معقول ہوتی ہے تو اس صورت میں اہل ایمان کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ منکرین کے خلاف اعلان جنگ کریں اور یہ جنگ اس وقت تک جاری رکھیں جب تک یہ منکرین توبہ کر کے خدا کے دین کو قبول نہ کر لیں، یا ان کی نجاست سے خدا کی زمین پاک نہ ہو جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اتمامِ حجت کے بعد بنی اسماعیل کے خلاف اسی قسم کی جنگ کے اعلان کا حکم دیا گیا۔

یہ قانون جس اصل پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کے رسول اس کے قانونِ مکافات کے مظہر ہوتے ہیں وہ زمین میں خدا کی عدالت بن کر آتے ہیں اور ان کی بعثت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حق و باطل میں فیصلہ ہو جائے، اہل حق کامیاب و فائز المرام ہوں اور اہل باطل ناکام و نامراد ہوں۔ اور چونکہ اس طرح کی جزا وسزا کے لیے ضروری ہے کہ سزا پانے

والوں پر خدا کی حجت پوری طرح تمام کر دی جائے اس وجہ سے رسول اتمامِ حجت کے تمام شرائط کے ساتھ بھیجے جاتے ہیں۔ یہ شرطیں جب پوری ہو جاتی ہیں تو خدا کا قانون ان لوگوں کو جینے کی مہلت نہیں دیتا جو نری ہٹ دھرمی کی وجہ سے حق کا انکار کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سزا چونکہ اس اتمامِ حجت کے بعد دی جاتی ہے جس کے بعد اس دنیا میں اتمامِ حجت کا کوئی اور درجہ باقی نہیں رہ جاتا اس وجہ سے اس کو جبر و اکراہ نہیں قرار دیا جاسکتا، بلکہ یہ عدل و انصاف کا عین مقتضی ہے۔ رسولوں کے ذریعہ سے اتمامِ حجت ہو چکنے کے بعد بھی جو لوگ اللہ کے دین کو قبول نہیں کرتے ان کے لیے اگر کوئی اور چیز باقی رہ جاتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ غیب کے پردے اٹھا دیئے جائیں اور ان کو تمام حقائق کا آنکھوں سے مشاہدہ کرا دیا جائے، لیکن اس طرح کا کشفِ حجاب اللہ تعالیٰ کی اس سنت کے خلاف ہے جو اس دنیا میں جاری ہے۔ اس دنیا میں ہم سے ایمان و اسلام کا مطالبہ عقل و استدلال کی بنا پر کیا گیا ہے، نہ کہ مشاہدہ اور معائنہ کی بنا پر۔ اس وجہ سے عقل و استدلال کے لیے جو کچھ مطلوب ہے، جب رسولوں کے واسطہ سے وہ مل چکتا ہے تو اس کے بعد مہلت ملنے کے کوئی معنی ہیں اور اس کے بعد سزا دینے میں جبر کا بھی کوئی پہلو نہیں ہے۔

(ب) دوسری صورت یہ ہے کہ یہ تبلیغ صالحین کے ذریعہ سے ہو۔ صالحین کے ذریعہ سے اس درجہ کا اتمامِ حجت ممکن نہیں ہے جس درجہ کا اتمامِ حجت رسولوں کے ذریعہ سے ممکن ہے۔ نہ یہ ان اسباب و وسائل ہی سے پوری طرح بہرہ مند ہوتے ہیں جو رسولوں کے پاس ہوتے ہیں، اور نہ ان کی ذہنی اور قلبی حالتیں ہی وہ ہو سکتی ہیں جو اللہ کے رسولوں کی خصوصیات میں سے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کا شبہات اور بدگمانیوں سے اس درجہ بالاتر ہونا بھی ناممکن ہے جس طرح اللہ کے یہ معصوم رسول ان چیزوں سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ منکرین حق کے خلاف جو جنگ کرتے ہیں اس کی غایت صرف عدل اور امن کا قیام ہے۔ ان کو صرف یہ حق حاصل ہے کہ جو لوگ خدا کے دین کو قبول نہ کریں ان سے جنگ کر کے ان کے ہاتھوں سے اس سیاسی طاقت کو چھین لیں جو ان کی بیماریوں کو دوسرے

بندگانِ خدا تک متعدی کرسکتی ہے اور جتنے سے ان کا یہ مقصد پورا ہو جائے اسی حد پر ان کو رک جانا چاہیے۔ اس حد سے آگے بڑھنے کی ان کو اجازت نہیں ہے۔ اگر اس حد متعین سے ایک قدم بھی وہ تجاوز کر جائیں تو اس پر خدا کے ہاں وہ باز پرس کے مستحق ہوں گے۔ اسی طرح کی جنگیں ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہؓ کے زمانوں میں ہوئیں۔ صحابہؓ اپنی مخالف قوموں کے سامنے تین متبادل چیزیں پیش کیا کرتے تھے: ایک یہ کہ اسلام لاؤ اور اسلام لا کر ہر چیز میں ہمارے برابر کے شریک و سہیم بن جاؤ، دوسری یہ کہ اسلامی حکومت کی رعایا بن جاؤ اور ایک متعین ٹیکس ادا کر کے اپنے پرسنل لا کے سوا تمام امور میں ہمارے نظام کی اطاعت کرو، تیسری یہ کہ ہمارے اعلان جنگ کو قبول کرو۔ اس صورت میں اگرچہ یہ گمان ہوتا ہے کہ صحابہؓ کی یہ تبلیغ نہایت اجمالی تھی اور وہ اس تفصیل و وضاحت کے ساتھ دین حق کو لوگوں کے سامنے پیش نہیں کرتے تھے جس تفصیل و وضاحت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا یا جس تفصیل و وضاحت کے ساتھ اس کو اچھی طرح دل نشین کرنے کے لیے پیش کرنا ضروری ہے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ صحابہؓ کے زمانہ میں ایک نظامِ حق عملاً قائم ہو چکا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد دعوت میں موجود نہیں تھا اس وجہ سے صحابہؓ اسلام کی تفہیم کے لیے کسی تفصیلی تبلیغ سے مستغنی تھے۔ ان کا قائم شدہ نظامِ حق خود اس حقیقت کے اظہار کے لیے کافی تھا کہ اسلام کیا ہے اور وہ بندگانِ خدا سے ان کی انفرادی و اجتماعی زندگیوں میں کن باتوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس عملی نظام کی وجہ سے ہر حقیقت ان کے زمانہ میں نمایاں اور ہر بات واضح تھی۔ عقیدہ ہو یا عمل، معاشرت ہو یا سیاست، ہر چیز ایک مکمل حیاتِ اجتماعی کے پیکر میں دنیا کی نگاہوں کے سامنے موجود تھی اور ہر شخص اس کو آنکھوں سے دیکھ کر یہ معلوم کرسکتا تھا کہ اسلام کا ظاہر و باطن کیا ہے اور وہ کن اعتبارات سے دنیا کے تمام نظاموں پر فوقیت رکھتا ہے اور کیوں اسی کو حق حاصل ہے کہ وہ باقی رہے اور اس کے سوا دنیا کے سارے نظام مٹ جائیں۔ اس طرح کا نظام جب بھی دنیا میں قائم و موجود ہو تو وہ اہل حق کو تفصیلی دعوت کی ذمہ داریوں سے

سبکدوش کر دے گا اور مجرد اس کے قیام کی وجہ سے اہل حق کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ لوگوں سے اس کی اطاعت کا مطالبہ کریں اور اگر لوگ اس مطالبہ سے انکار کریں تو وہ ان سے جنگ کر کے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے پر مجبور کریں۔ اسلام، عدم اتمامِ حجت کی صورت میں، جو غیر رسل کی دعوت میں متصور ہے، لوگوں کے اس انفرادی حق کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ جس عقیدہ پر چاہیں قائم رہیں، لیکن وہ کسی گروہ کے لیے یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ وہ کسی غیر عادلانہ نظامِ حیات کو لوگوں پر بجبر مسلط کرے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ یہ جنگ صالحین کے ذریعہ سے لڑی جائے۔ کیونکہ اسلامی جہاد دنیا کو فساد سے پاک کرنے کے لیے ہے، اس وجہ سے ان لوگوں کا جہاد کے لیے اٹھنا کوئی معنی نہیں رکھتا جو خود فساد سے آلودہ ہوں۔ یہ کام صرف انہی لوگوں کے کرنے کا ہے اور وہی لوگ اس کو کر سکتے ہیں جو سو فی صد اس مقصد پر ایمان رکھتے ہوں جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے یہ بات جائز ہے کہ وہ تلوار اٹھائیں اور ان ہی لوگوں کی جنگ جہاد فی سبیل اللہ کے الفاظ سے تعبیر کی گئی ہے۔ یہ لوگ اگر اس راہ میں مارے جائیں تو شہید ہوتے ہیں، اور اگر زندہ رہتے ہیں تو غازی اور مجاہد فی سبیل اللہ کے لقب کے مستحق ہیں۔ جو لوگ اس حق و عدل پر ایمان نہ رکھتے ہوں، جس کے قیام کے لیے جہاد کا حکم دیا گیا ہے، ان کو اسلام ہرگز یہ حق نہیں دیتا کہ وہ کسی ایک متنفس کا بھی خون بہائیں اور اگر وہ بہائیں گے تو ان کا یہ فعل ایک مفسدانہ فعل ہوگا اور اس پر ان سے مواخذہ ہوگا۔ اسلامی فوج کرایہ کے آدمیوں سے نہیں بنتی، بلکہ وہ ایسے لوگوں سے مرکب ہوتی ہے جو اسلام پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اسی کی خاطر لڑتے مرتے ہیں۔ اسلامی نظام کی یہ عین فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ صرف اپنے معتقدین ہی کے ذریعہ برپا ہو اور وہی لوگ اس کے برپا کرنے میں ساعی ہوں جو یہ سعی محض رضائے الٰہی کے حصول اور اقامت حق کی خاطر کریں، نہ کہ کسی دنیوی مفاد کی خاطر۔ اگر ان کی سعی میں حصولِ رضائے الٰہی اور اقامت حق کی خاطر کے پاک جذبہ کے سوا کوئی اور جذبہ شامل ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ ان کی اس سعی کی اسلام

کی نظر میں کوئی قیمت نہیں ہے، بلکہ جو خون بھی اس سلسلہ میں انہوں نے بہایا ہے اس کا وبال ان کی گردن پر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ رسولوں نے جہاد کے اعلان سے پہلے اس فرض کے لیے صالحین کی جماعت بنائی، کرایہ کے آدمیوں کی کوئی فوج نہیں مرتب کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کے سلسلہ میں بعض ایسے مواقع بھی پیش آئے کہ ایسے لوگوں نے مسلمانوں کی حمایت میں لڑنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں جو اسلام پر عقیدہ نہیں رکھتے تھے اور محض قومی عصبیت کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے ان کی پیش کش قبول نہیں فرمائی اور صاف فرمادیا کہ میں اس کام میں ان لوگوں کی مدد سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا جو اس مقصد پر ایمان نہ رکھتے ہوں جس مقصد کے لیے یہ لڑائی لڑی جارہی ہے۔ حضرت موسیٰ، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام نے جو غزوات کیے وہ تمام تر مومنین صالحین کے ذریعہ سے کیے۔

یہی بات صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی ثابت ہے کہ ان کے زمانوں میں جتنے بھی غزوات ہوئے، سب انہی لوگوں کے ذریعہ ہوئے جو اعتقاداً اور عملاً اس چیز کو تسلیم کرتے تھے جس کو برپا کرنے کے لیے انہوں نے تلوار اٹھائی تھی اور باوجودیکہ ان کے اثرات بہت وسیع تھے اور وہ چاہتے تو آسانی سے کرایہ کی فوج جمع کر لیتے، لیکن نہ صرف یہ کہ انہوں نے کرایہ کی کوئی فوج نہیں بھرتی کی، بلکہ خود اپنی بھی کوئی تنخواہ دار مستقل فوج نہیں قائم کی۔ جب جنگ کی حالت پیش آجاتی تو ہر شخص اپنا توشہ اور اپنی سواری لے کر نکلتا اور محض اقامت دین کی خاطر جہاد کرتا اور احتیاط اور تقویٰ کی شان یہ تھی کہ عین اس وقت جب کہ دشمن سے ردو بدل ہو رہی ہوتی اگر کسی کے دل میں یہ خطرہ بھی گزر جاتا کہ اس وقت حصول رضائے الٰہی کے جذبہ کے سوا کسی اور نفسانی جذبہ سے وہ مغلوب ہوگیا ہے تو فوراً ہی اپنی کھنچی ہوئی تلوار میان میں کر لیتا کہ مبادا یہ کسی انسان کا خون محض نفس کو خوش کرنے کے لیے بہادے۔[1]

[1] اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا بعض حالات میں اسلامی جنگ میں حصہ لے سکتی ہے۔ لیکن اس کے شرائط و حالات بالکل خاص ہیں یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث ہم نے اپنی کتاب ''اسلامی ریاست'' میں کی ہے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ جنگ ایک بااختیار اور باقتدار امیر کی قیادت و امارت میں لڑی جائے۔ بااختیار و بااقتدار امیر سے مطلب یہ ہے کہ اس کا اقتدار اپنی جماعت پر بزور وقوت قائم ہو۔ وہ لوگوں پر شریعت کے احکام نافذ کر کے اس کی اطاعت پر لوگوں کو مجبور کر سکتا ہو اور خدا کے سوا کسی اور بالاتر اقتدار کا وہ محکوم نہ ہو۔ اس شرط کا سب سے زیادہ واضح ثبوت یہ ہے کہ انبیائے کرام میں سے کسی نے بھی اس وقت تک جہاد کا اعلان نہیں کیا جب تک انہوں نے ہجرت کر کے اپنی جماعت کو کسی آزاد علاقہ میں منظم نہیں کر لیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی سے بھی اس چیز کا ثبوت ملتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے بھی اس بات کی شہادت ملتی ہے۔ بعد کے زمانوں میں بھی جن لوگوں نے انبیاء کے طریقہ پر یہ فرض انجام دینے کی کوشش کی، مثلاً حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید۔ انہوں نے بھی اس امر کو پیش نظر رکھا اور ایک آزاد علاقہ میں پہنچ کر پہلے اپنی ایک بااختیار امارات بھی قائم کی اور اپنی جماعت کی تنظیم کر کے اس کے اندر شریعت کے تمام احکام وقوانین کا نفاذ بھی کیا۔

اس شرط کی دو وجہیں ہیں:

(ا) پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی باطل نظام کے اختلال و انتشار کو بھی اس وقت تک پسند نہیں کرتا جب تک اس بات کا امکان نہ ہو کہ جو لوگ اس باطل نظام کو درہم برہم کر رہے ہیں وہ اس کی جگہ پر کوئی نظامِ حق بھی قائم کر سکیں گے۔ انارکی اور بے نظمی کی حالت ایک غیر فطری حالت ہے، بلکہ انسانی فطرت سے یہ اس قدر بعید ہے کہ ایک غیر عادلانہ نظام بھی اس کے مقابل میں قابل ترجیح ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کسی ایسی جماعت کو جنگ چھیڑنے کا اختیار نہیں دیا ہے جو بالکل مبہم اور مجہول ہو، جس کی قوت و استطاعت غیر معلوم اور مشتبہ ہو، جس پر کسی ایک بااختیار امیر کا اقتدار قائم نہ ہو، جس کی اطاعت و وفاداری کا امتحان نہ ہوا ہو، جس کے افراد منتشر اور پراگندہ ہوں، جو کسی نظام کو درہم برہم تو کر سکتے ہوں، لیکن اس بات کا کوئی ثبوت انہوں نے بہم نہ پہنچایا ہو کہ وہ کسی انتشار کو مجتمع بھی کر سکتے ہیں۔ یہ اعتماد صرف ایک ایسی جماعت ہی پر کیا جا سکتا ہے جس نے بالفعل ایک

سیاسی جماعت کی صورت اختیار کر لی ہو اور جو اپنے دائرہ کے اندر ایک ایسا ضبط و نظم رکھتی ہو کہ اس پر ''الجماعت'' کا اطلاق ہو سکے۔ اس حیثیت کے حاصل ہونے سے پہلے کسی جماعت کو یہ حق تو حاصل ہے کہ وہ ''الجماعت'' بننے کے لیے جدوجہد کرے اور اس کی یہ جدوجہد جہاد ہی کے حکم میں ہوگی، لیکن اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ عملاً جہاد بالسیف اور قتال کے لیے اقدام شروع کر دے۔

(ب) دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی جنگ کرنے والی جماعت کو انسانوں کے جان و مال پر جو اختیار حاصل ہو جایا کرتا ہے وہ ایسا غیر معمولی اور اہم ہے کہ کوئی ایسی جماعت اس کو سنبھال ہی نہیں سکتی جس کے لیڈر کا اقتدار اس کے اوپر محض اخلاقی قسم کا ہو۔ اخلاقی اقتدار اس امر کی کافی ضمانت نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے فساد فی الارض کو روک سکے۔ اس وجہ سے مجرد اخلاقی اقتدار کے اعتماد پر کسی اسلامی لیڈر کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت دے دے، ورنہ اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ جب ایک مرتبہ ان کی تلوار چمک جائے گی تو وہ حلال و حرام کے حدود کی پابند نہیں رہے گی اور ان کے ہاتھوں وہ سب کچھ ہو جائے گا جس کے مٹانے ہی کے لیے اس نے تلوار اٹھائی ہے۔ عام انقلابی جماعتیں، جو مجرد ایک انقلاب برپا کرنا چاہتی ہیں اور جن کا مطمع نظر اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ وہ قائم شدہ نظام کو درہم برہم کر کے برسر اقتدار پارٹی کے اقتدار کو مٹائیں اور اس کی جگہ اپنا اقتدار جمائیں، اس قسم کی بازیاں کھیلتی ہیں اور کھیل سکتی ہیں۔ ان کے نزدیک، نہ کسی نظم کا اختلال کوئی حادثہ ہے، نہ کسی ظلم کا ارتکاب کوئی معصیت، اس وجہ سے ان کے لیے سب کچھ مباح ہے۔ لیکن ایک عادل اور حق پسند جماعت کے لیڈروں کو لازماً یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ جس نظم سے وہ خدا کے بندوں کو محروم کر رہے ہیں اس سے بہتر نظم ان کے واسطے مہیا کرنے کی وہ صلاحیت رکھتے ہیں یا نہیں اور جس ظلم کو مٹانے کے وہ درپے ہیں اس قسم کے مظالم سے اپنے آدمیوں کو بھی روکنے پر وہ پوری طرح قادر ہیں یا نہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ محض اتفاقات کے اعتماد پر وہ لوگوں کے جان و مال کے ساتھ

بازیاں کھیلیں اور جس فساد کو مٹانے کے لیے اٹھے ہیں اس سے بڑا فساد خود برپا کرا دیں۔

چوتھی شرط حصول قوت ہے لیکن صالحین کی جماعت کو اس کے لیے کوئی علیحدہ اہتمام کرنا نہیں پڑتا۔ اوپر تین شرطیں بیان ہوئی ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک پورے کر دینے سے ضروری قوت خود بخود بہم ہو جاتی ہے۔ ایک صحیح دعوت ہر قوت و استعداد کے آدمیوں کو اپنے اردگرد مجتمع کر لیتی ہے اور ان کے واسطے سے سرمایہ بھی بہم ہو جاتا ہے اور ضروری وسائل کار یا ان کے پیدا کرنے کی قابلیتیں بھی فراہم ہو جاتی ہیں۔ پھر جب یہ جماعت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ایک آزاد ماحول میں اپنے آپ کو ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے ایک باقتدار امیر کی اطاعت پر جمع کر لیتے ہیں تو ان کی اخلاقی اور معنوی قوت بھی دو چند ہو جاتی ہے اور مادی وسائل کے فراہم کرنے اور پیدا کرنے کے امکانات بھی وسیع تر ہو جاتے ہیں۔ پس جہاں تک حصولِ طاقت کی سعی کا تعلق ہے وہ فی الحقیقت ان شرائط کی تکمیل کے اندر ہی مضمر ہے۔ اس سے علیحدہ اس کے لیے کسی خاص مہم کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ تاہم جارحانہ جنگ کے لیے قوت کی فراہمی بھی ایک ضروری شرط ہے۔ اس کے بغیر کوئی جماعت جنگ کا اعلان کر دے تو وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کی مجرم ہوگی۔

ان تمام شرائط کی نوعیت پر غور کرنے کے بعد یہ حقیقت آپ سے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ کسی دعوت حق کے سلسلہ میں جنگ کا مرحلہ شہادت علی الناس اور ہجرت کے مراحل کے بعد کیوں آتا ہے۔ درحقیقت ان دونوں مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہی وہ لوگ متعین ہو کر سامنے آتے ہیں جن سے اسلام میں جنگ جائز ہے اور ان مراحل سے گزر چکنے کے بعد ہی وہ جماعت بھی صحیح معنوں میں وجود میں آتی ہے جس کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ تلوار کے زور سے امن و عدل قائم کرے۔ جو لوگ انبیائے کرام کی اس ترتیب کار سے واقف نہیں ہیں اور صرف عام انقلابی جماعتوں کے طریق کار ہی سے متاثر ہیں کو ان تمام مراحل کے فوائد اور نتائج پر غور کرنا چاہیے۔

فاران فاؤنڈیشن